قیصر الجعفری
اگر دریا ملا ہوتا
Meer Zaheer Abass Rustmani

نام : زبیر احمد جعفری

والد کا نام : قاضی صغیر احمد

تخلّص : قیصر الجعفری

وطنِ مالوف : نظر گنج، تحصیل چائل، ضلع الہ آباد

وطنِ ثانی : موئی کلاں، تحصیل کنڈہ،
ضلع پرتاپ گڑھ

ولادت : ۱۴؍ ستمبر ۱۹۲۶ء

وفات : یکم رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ
(۵؍ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

خط و کتابت کا پتہ : B-104 تنور باغ، مولانا حسرت موہانی روڈ، کوسہ۔ ممبرا، ضلع تھانے۔ ممبئی (مہاراشٹر)

شعری تصنیفات

رنگِ حنا	۱۹۶۴ء	
نبوت کے چراغ	۱۹۶۴ء	نعتیہ
سنگ آشنا	۱۹۷۷ء	
دشتِ بے تمنا	۱۹۸۷ء	
پتھر ہوا میں پھینکے	۱۹۹۵ء	دیوناگری
چراغ حرا	۱۹۹۷ء	منظوم سیرت النبیؐ
مولسری کا پھول	۲۰۰۱ء	انتخاب
اگر دریا ملا ہوتا	۲۰۰۵ء	
دیواروں سے مل کر رونا	۲۰۰۵ء	دیوناگری
بستی کتنی دور بسالی	۲۰۰۵ء	دیوناگی
آوارہ ہوا کا جھونکا	۲۰۰۵ء	دیوناگری

قیصر الجعفری

اگر دریا ملا ہوتا

شعری مجموعہ

زیرِ اہتمام

قیصر الجعفری فاؤنڈیشن، ممبئی

نامِ کتاب : اگر دریا ملا ہوتا
Agar Darya Mila Hota

شاعر : قیصر الجعفری

104-B تنویر باغ، مولانا حسرت موہانی روڈ، کوسہ (ممبرا)، تھانے
(مہاراشٹر) فون: 022-5352046

ترتیب وانتخاب : اظہار احمد خان، عرفان جعفری

سرورق : کینواس آرٹ، کوسہ ممبرا

کمپیوگرافی : جمیل احمد- الفا گرافکس، ممبرا : 25466444(022)

سالِ طباعت : ۲۰۰۵ء تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۲۰۰ روپئے US$ 15

ناشر : فاران پبلشرز، ممبئی
Faran Publishers, Lucky Hall, Pipe Road,
Brahmanwadi, Kurla(W), Mumbai-400070.

ملنے کے پتے

فاران پبلشرز، ممبئی
سیفی بکڈپو، امین بلڈنگ، جے جے اسپتال ناکہ، ممبئی
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، دہلی ۱۱۰۰۰۶
گلستانِ اردو، H/8، وائرلیس کالونی، دُشینت کمار تیاگی روڈ، بھوپال
صالحہ بکڈپو، مومن پورہ، ناگپور

طباعت: انجمن اسلام اردو بی پرنٹنگ پریس

انتساب

ان دعاؤں کے نام

جو

تہہ خاک آج بھی روشن ہیں

اسلاف کے کچھ نام تو چہرے پہ لکھے ہیں
ویرانے میں ٹوٹی ہوئی دیوار سہی ہم

قیصر الجعفری

رمضان کی پہلی شب کی اولین ساعتوں میں ابو جی بھی ان دعاؤں میں شامل ہو گئے جو خاک کی تہوں میں روشن ہیں۔ ۵/اکتوبر ۲۰۰۵ء کی شام نے ان کے نام کے آگے مرحوم کا اضافہ کر دیا۔ اسی مجموعہ کے مسودے کو لے کر وہ گھر سے نکلے تھے اور سڑک پر حادثہ کا شکار ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اس کی اشاعت کے وہ بہت بے تابی سے منتظر تھے۔ مجموعہ تو چھپ گیا پر وہ خود نہیں رہے۔ لیکن ان کے پرستار، ان کے چاہنے والے، ان کے لئے ان کی زندگی اور موت کے بعد دعائیں دینے والے یہ ثابت کریں گے کہ وہ کہیں نہیں گئے وہ خود اپنے مجموعے کے ہر شعر میں موجود ہیں۔

عرفان جعفری

اگر دریا ملا ہوتا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

اگر دریا ملا ہوتا

اگر دیا ملا ہوتا

اگر دریا ملا ہوتا

مَنظومَات

ہماری پیاس تھی جس نے ہمیں زندہ رکھا قیصرؔ
اگر دریا ملا ہوتا تو ہم ساحل پہ مر جاتے

قیصرؔ

○

نظر کو انجمنِ راز تک رسائی بھی دے
ملی ہے تابِ بصارت تو کچھ دکھائی بھی دے

مرے خدا! مجھے تھوڑا سا اختیارِ سفر
بھنور دیئے ہیں تو یارائے ناخدائی بھی دے

زمیں پہ پھول بچھانے کی آرزو ہے مجھے
جنوں کو وسعتِ صحرا سے آشنائی بھی دے

مری شکست ترا امتحاں نہ بن جائے
انا سپرد کرے کاسۂ گدائی بھی دے

وہ ٹوٹتی ہوئی دنیا کا شور ہے یارب!
کہ معجزہ ہے جو ایسے میں کچھ سنائی بھی دے

بعید کیا ہے، جسے ہم خزاں سمجھتے ہیں
بہار بن کے خرابوں کو دلربائی بھی دے

سرِ صلیب خموشی مرا طریق نہیں
زبان دی ہے تو احساس نے نوائی بھی دے

میں ایسی سر پھری دنیا کو کیا کہوں قیصرؔ
کہ سنگِ راہ بنے طعنِ نارسائی بھی دے

❖❖❖

○

جو تحریریں ہیں تابندہ رہیں گی
ہماری انگلیاں زندہ رہیں گی

بجھا کر اور روشن کر دیا ہے
ہوائیں ہم سے شرمندہ رہیں گی

لکھی جائے گی جب تاریخِ مقتل
مری گلیاں نمائندہ رہیں گی

بلندی پر رکھو سچائیوں کو
کنوئیں میں گر کے کیا زندہ رہیں گی

کہاں تک ہم بھی سر پھوڑیں گے اپنا
یہ دیواریں جو آئندہ رہیں گی

ہماری راکھ بکھرا دو ہوا میں
مگر چنگاریاں زندہ رہیں گی

حقیقت یوں بدل دی ہم نے قیصرؔ
کتابیں ہم سے شرمندہ رہیں گی

❖

○

دانشوروں کے بس میں یہ ردِ عمل نہ تھا
میں ایسی تیغ لے کے اٹھا جس میں پھل نہ تھا

کیا درد ٹوٹ ٹوٹ کے برسا ہے رات بھر
اتنا غبار تو مرے چہرے پہ کل نہ تھا

پتھراؤ کر رہا ہے وہ خود اپنی ذات پر
کیا دل کے مسئلے کا کوئی اور حل نہ تھا

اگر دریا ملا ہوتا

شاخیں لدی ہوئی تھیں تو پتھر نہ تھا نصیب
پتھر پڑے ملے تو درختوں میں پھل نہ تھا

شب کی ہوا سے ہار گئی میرے دل کی آگ
یخ بستہ شہر میں کوئی ردّ و بدل نہ تھا

اب ایک ایک حرف سے چھنتی ہے روشنی
تم سے ملے نہ تھے تو یہ حسنِ غزل نہ تھا

یہ کہہ کے سب نے برف میں دفنا دیا مجھے
کیوں دوسروں کی طرح مرا ذہن شل نہ تھا

قیصرؔ ضمیرِ وقت کو دیکھا کرید کے
صدیاں رکھی تھیں دوش پہ، مٹھی میں پل نہ تھا

○

اے شام! زخم زخم یہ تو کیسے ہو گئی
خوشبو ترے بدن کی لہو کیسے ہو گئی

ملتی تھی رات ہم سے کبھی میکدہ بدوش
اب بے نیازِ جام و سبو کیسے ہو گئی

کل زندگی اذاں کی طرح بے کنار تھی
اب گھٹ کے اک فقیر کی ہو کیسے ہو گئی

ریشم بچھا رہی تھی یہ کل پاؤں کے تلے
اب راہِ شوق آبلہ خو کیسے ہو گئی

شاید بدل گئے ہیں نگاہوں کے زاویے
کالی چٹان آئینہ رو کیسے ہو گئی

قیصرؔ قبائے چاک پہ چھوڑو بھی تبصرہ
اتنی دریدہ تھی تو رفو کیسے ہو گئی

○

گھر بسا کر بھی مسافر کے مسافر ٹھہرے
لوگ دروازوں سے نکلے کہ مہاجر ٹھہرے

دل کے مدفن پہ نہیں کوئی بھی رونے والا
اپنی درگاہ کے ہم خود ہی مجاور ٹھہرے

اس بیاباں کی نگاہوں میں مروّت نہ رہی
کون جانے کہ کوئی شرطِ سفر پھر ٹھہرے

پتّیاں ٹوٹ کے پتھر کی طرح لگتی ہیں
ان درختوں کے تلے کون مسافر ٹھہرے

خشک پتے کی طرح جسم اُڑا جاتا ہے
کیا پڑی ہے جو یہ آندھی مری خاطر ٹھہرے

شاخِ گل چھوڑ کے دیوار پہ آ بیٹھے ہیں
وہ پرندے جو اندھیروں کے مسافر ٹھہرے

اپنی بربادی کی تصویر اتاروں کیسے
چند لمحوں کے لئے بھی نہ مناظر ٹھہرے

تشنگی کب کے گناہوں کی سزا ہے قیصرؔ
وہ کنواں سوکھ گیا جس پہ مسافر ٹھہرے

○

خیال و خواب بن کے میرے ذہن سے لپٹ گئے
وہ اتنی دور ہو گئے کہ فاصلے سمٹ گئے

صبا ہمیں تلاش کر کے زخم زخم ہو گئی
سنا ہے خوشبوؤں کے سارے قافلے پلٹ گئے

تعلقات کا سفر ہے اور تیز دھوپ ہے
رفاقتوں کے راستے کے سارے پیڑ کٹ گئے

خراب موسموں کے شور میں خلوص بہہ گیا
جو نا خدا بنے تھے اپنی ناؤ لے کے ہٹ گئے

خلا میں اب بدن سنبھالتے رہو تمام عمر
کہ حادثے تو پاؤں کی زمین لے کے ہٹ گئے

ادھوری زندگی کو اب لئے پھریں کہاں کہاں
کتاب دل سے اس کے نام کے ورق تو پھٹ گئے

وہ آنکھ بھر کے اپنے داغ دیکھتا نہ دیکھتا
یہ آئینوں کو کیا ہوا کہ سامنے سے ہٹ گئے

نئی صدی سلام کرنے آ رہی تھی جعفریؔ
چراغ پھینک کر ہمیں گپھاؤں میں پلٹ گئے

○

ہوا بہت ہے، متاعِ سفر سنبھال کے رکھ
دریدہ چادرِ جاں ہے مگر سنبھال کے رکھ

پھر اس کے بعد تو قدریں انھیں پہ اُٹھیں گی
کچھ اور روز یہ دیوار و در سنبھال کے رکھ

ابھی اڑان کے سو امتحان باقی ہیں
ان آندھیوں میں ذرا بال و پر سنبھال کے رکھ

یہ عہد کانپ رہا ہے زمیں کے اندر تک
تُو اپنا ہاتھ بھی دیوار پر سنبھال کے رکھ

پڑھیں گے لوگ انہیں میں کہانیاں تیری
کچھ اور روز یہ دامانِ تر سنبھال کے رکھ

بڑا جنوں تھا تجھے آسمان ہونے کا
زمین! لے یہ ہزاروں کھنڈر سنبھال کے رکھ

ہوا کے ایک ہی جھونکے کی دیر ہے قیصرؔ
کسی بھی طاق پہ شمعِ سحر سنبھال کے رکھ

○

وہ رات ہے کہ چراغِ نظر بھی ختم سمجھ
ہمارے بعد غزل کا ہنر بھی ختم سمجھ

دکھائی دیتی نہیں منزلوں کی تابانی
یہ کارواں ہے تو رسمِ سفر بھی ختم سمجھ

ہوا نے برف جما دی ہے آسمانوں پر
بس اک اڑان میں یہ بال و پر بھی ختم سمجھ

مرے وجود پہ صدیوں کا بوجھ رکھا تھا
زمین بیٹھ گئی بام و در بھی ختم سمجھ

دعا سلام کی فرصت بھی اب کسی کو نہیں
یہ کاروبارِ سرِ رہ گزر بھی ختم سمجھ

پرانے دور کی تہذیب بُجھ گئی قیصرؔ
یہ دھوپ شام کی دیوار پر بھی ختم سمجھ

❖

○

برسوں کے رتجگوں کی تھکن کھا گئی مجھے
سورج نکل رہا تھا کہ نیند آ گئی مجھے

رکھی نہ زندگی نے مری مفلسی کی شرم
چادر بنا کے راہ میں پھیلا گئی مجھے

میں بک گیا تھا بعد میں بے صرفہ جان کر
دنیا مری دکان پہ لوٹا گئی مجھے

دریا پہ ایک طنز سمجھئے کہ تشنگی
ساحل کی سرد ریت میں دفنا گئی مجھے

اے زندگی! تمام لہو رائیگاں ہوا
کس دشتِ بے سواد میں برسا گئی مجھے

کاغذ کا چاند رکھ دیا دنیا نے ہاتھ میں
پہلے سفر کی رات ہی راس آ گئی مجھے

کیا چیز تھی کسی کی ادائے سپردگی
بھیگے بدن کی آگ میں نہلا گئی مجھے

قیصرؔ قلم کی آگ کا احسان مند ہوں
جب انگلیاں جلیں تو غزل آ گئی مجھے

❖

○

تہمتِ دشت نوردی مرے سر اتنی تھی
روح تک اُڑ کے گئی گردِ سفر اتنی تھی

ذہن سے مٹ ہی گیا بے ہنری کا مفہوم
بے ہنر شہر میں تشہیرِ ہنر اتنی تھی

چاندنی کس کے لئے تھی مجھے معلوم نہ تھا
میری آنکھوں کو اجڑنا ہے خبر اتنی تھی

بادلوں سے کوئی پوچھے یہ تعلّی کیا ہے
گاؤں کیوں جل گئے برسات اگر اتنی تھی

زندگی اپنی فقط راہ بناتے گزری
بھیڑ لوگوں کی سرِ راہ گزر اتنی تھی

خودغرض رات نے مٹھی نہیں کھولی اپنی
ورنہ صدیاں بھی نہالیتیں سحر اتنی تھی

ایک اک تار پہ سو داغ لگے ہیں قیصرؔ
میرے دامن پہ زمانے کی نظر اتنی تھی

❖

○

کاغذ کاغذ دھول اُڑے گی فن بنجر ہو جائے گا
جس دن سوکھے دل کے آنسو سب پتھر ہو جائے گا

ٹوٹیں گی جب نیند سے پلکیں، سو جاؤں گا چپکے سے
جس جنگل میں رات پڑے گی، میرا گھر ہو جائے گا

خوابوں کے یہ پنچھی کب تک شور کرینگے پلکوں پر
شام ڈھلے گی اور سناٹا شاخوں پر ہو جائے گا

رات قلم لے کر آئے گی اتنی سیاہی چھڑکے گی
دن کا سارا منظر نامہ بے منظر ہو جائے گا

ناخن سے بھی اینٹ کریدیں مل جل کر ہمسائے تو
آنگن کی دیوار نہ ٹوٹے لیکن در ہو جائے گا

قیصرؔ رولو، غزلیں کہہ لو، باقی ہے کچھ درد ابھی
اگلی رُتوں میں یوں لگتا ہے سب پتھر ہو جائے گا

❖

○

آنکھ رکھتے ہوئے توہینِ نظر کون کرے
ناؤ ٹوٹی ہوئی دیکھے تو سفر کون کرے

سب یہاں پار اُترنے کے لئے بیٹھے ہیں
سامنا تُند ہواؤں کا مگر کون کرے

لاش بے گور و کفن کب سے پڑی ہے باہر
سبھی قاتل ہوں تو بستی میں خبر کون کرے

لوگ جنگل کے درختوں کو اٹھا لے گئے گھر
دُھوپ میں جلتے پرندوں پہ نظر کون کرے

دور تک راہ میں چھایا ہے خزاں کا منظر
خواب آنکھوں میں نہ مہکے تو سفر کون کرے

جھلملا دے تجھے اک موجِ ہوا کی آہٹ
شمع بے مایہ! ترے ساتھ سحر کون کرے

امتحانِ دل و جاں ہے یہ محبت کی صلیب
سہل ہو معرکہء شوق تو سر کون کرے

آج لفظوں کا بھرم ٹوٹ گیا ہے قیصرؔ
ہم بھی نقّاد ہیں تنقید مگر کون کرے

○

عذاب سا ہے دلِ نامراد پر کب سے
کھڑا ہوں میں روشِ گردباد پر کب سے

کبھی ملو گے کہیں تو ملو گے جیتے جی
میں جی رہا ہوں اسی اعتماد پر کب سے

جو باڑھ آئی تو بے چارہ بہہ گیا خود ہی
جو بند باندھ رہا تھا فساد پر کب سے

وہ زندگی جو کبھی مُڑ کے دیکھتی بھی نہیں
میں مر رہا ہوں اسی بدنہاد پر کب سے

مرے قلم پہ بھی شب خون پڑ گیا آخر
محاصرہ تھا مری جائیداد پر کب سے

میں روشنی کو بھلا دوں تو کیا تعجب ہے
برس رہا ہے دھواں میری یاد پر کب سے

مرے وجود میں کیا شاہکار ہے پنہاں
چڑھا رہا ہے زمانہ خراد پر کب سے

تمام شہرِ سماعت لرز اٹھا قیصر
نکل پڑی ہے خموشی جہاد پر کب سے؟

❖

○

یہ زندگی ہے کہ آسیب کا سفر ہے میاں
چراغ لے کے نکلنا بڑا ہنر ہے میاں

زمین پاؤں کے نیچے نہ آسماں سر پر
ہمارے سامنے یہ کیسی رہگزر ہے میاں

تمہارے شہر میں دیکھو تو ہم پہ کیا گزری
کہ تار تار قبا صرف جسم پر ہے میاں

ہزار عہد ہیں میرے شعور کی زد پر
ہزار سال کے آگے مری نظر ہے میاں

نہائیں گی مری ضَو میں ہزارہا صدیاں
میں وہ چراغ نہیں ہوں جو رات بھر ہے میاں

لکھا ہے وقت نے صدیوں سفر کے بعد اسے
یہ دَور جھوٹ سہی پھر بھی معتبر ہے میاں

ملے گی راکھ نہ تم کو ہمارے چہرے پر
بدن میں رہ کے سلگنا بڑا ہُنر ہے میاں

تم ایک شام کے جھونکے سے بُجھ گئے قیصرؔ
غبارِ دَرد کی بارش تو عمر بھر ہے میاں

❖❖❖

○

مجھے کوئی کیوں سمیٹے مری روشنی میں کیا ہے
وہ چراغِ رہگزر ہوں جو پسِ سحر جلا ہے

کوئی ایسا حادثہ ہو کہ مجھی کو دفن کر دے
جو ترس ترس کے برسے وہ غبارِ درد کیا ہے

ترے ذہن کا دھواں بھی نہ چھپا سکا وہ منظر
جسے کاٹ کر گرایا وہ شجر وہیں کھڑا ہے

مجھے کیا دکھا رہے ہو مرا داغِ نارسائی
مری جستجو سے پوچھو کوئی راستہ بچا ہے؟

مجھے ڈر ہے آسماں بھی کہیں زد میں آنہ جائے
تہہ خاک جو لہو ہے وہ زمیں کی بددعا ہے

ترے تیشۂ جنوں سے ہیں لہو لہو چٹانیں
ارے کچھ تو سوچنا تھا تہہ سنگ آئینہ ہے

تجھے بھولنے میں شاید مری عمر بیت جائے
تجھے بھولنے سے پہلے مجھے خود کو بھولنا ہے

نہ کہیں کتاب میں ہوں نہ کسی کے دل میں قیصرؔ
میں خیالِ رائیگاں ہوں مجھے کون سوچتا ہے

○

چھت کی مٹی سے برسنے لگے دھبّے کیسے
گھر میں تھے ہم تو یہ برسات میں بھیگے کیسے

ایک زنجیرِ انا دونوں طرف پاؤں میں تھی
بیچ میں سرحدِ انکار تھی ملتے کیسے

تم کو آیا نہ کناروں پہ کھڑا رہنا بھی
تم کہ دریاؤں میں اُترے نہیں، ڈوبے کیسے

میری بھیگی ہوئی پلکوں نے صدائیں دی تھیں
دل دھڑکنے کی وہ آواز نہ سنتے کیسے

رات بھر شور مچاتا ہے دل و جاں میں کوئی
صبح ہوتے ہی اجڑ جاتے ہیں رستے کیسے

کچی لکڑی کی طرح ظرف تمہارا ہوگا
تم سلگتے نہ جو اندر سے تو جلتے کیسے

کم سے کم عمر تو کٹ جانے دے روتے روتے
بے وفا! تجھ کو بھلا دوں میں ابھی سے کیسے

گھر سے نکلے تھے کہ کچھ دُھوپ چُرالیں قیصر
دشت سائے کی طرح پڑ گیا پیچھے کیسے

○

ڈوبنے والو! ہواؤں کا ہنر کیسا لگا
یہ کنارا، یہ سمندر، یہ بھنور کیسا لگا

پونچھتے جایئے دامن سے لہو ماتھے کا
سوچتے جایئے دیوار کو سر کیسا لگا

ہٹ گئی چھاؤں مگر لوگ وہیں بیٹھے ہیں
دشت کی دھوپ میں جانے وہ شجر کیسا لگا

در و دیوار ہیں، میں ہوں، مری تنہائی ہے
چاندنی رات سے پوچھو، مرا گھر کیسا لگا

اس سے پہلے کبھی پونچھے تھے کسی نے آنسو
اُن کا دامن تجھے اے دیدۂ تر! کیسا لگا

سہل تھیں مرحلۂ ترکِ وفا تک راہیں
اس سے آگے کوئی پوچھے کہ سفر کیسا لگا

آنکھ سے دیکھ لیا ترکِ وطن کا منظر!
گھر جہاں چھوڑ گئے تھے وہ کھنڈر کیسا لگا

وہ مجھے سُن کے بڑی دیر سے چُپ ہے قیصرؔ
جانے اس کو مری غزلوں کا ہنر کیسا لگا

❖❖

○

ذہن میں کون سے آسیب کا ڈر باندھ لیا
تم نے پوچھا بھی نہیں رختِ سفر باندھ لیا

بے مکانی کی بھی تہذیب ہوا کرتی ہے
ان پرندوں نے بھی ایک ایک شجر باندھ لیا

راستے میں کہیں گر جائے تو مجبوری ہے
میں نے دامانِ دریدہ میں ہنر باندھ لیا

اگر دریا ملا ہوتا

اپنے دامن پہ نظر کر، مرے ہاتھوں پہ نہ جا
میں نے پتھراؤ کیا تو نے ثمر باندھ لیا

گھر کھلا چھوڑ کے چپکے سے نکل جاؤں گا
شام ہی سے سروسامانِ سحر باندھ لیا

عمر بھر میں نے بھی ساحل کے قصیدے لکھے
میرے بچّوں نے بھی اک ریت کا گھر باندھ لیا

ہار بیدرد ہواؤں سے نہ مانی قیصرؔ
بادباں پھینک کے قدموں سے بھنور باندھ لیا

○

کھلا ہے درد کے صحرا کا راستہ، چلیے
عصا سنبھالیے، اٹھیے، برہنہ پا چلیے

سنا ہے جشنِ مکافات ہے سرِ مقتل
وہ آج بانٹنے بیٹھا ہے خوں بہا، چلیے

یہ زندگی بھی میاں! طے شدہ شہادت ہے
اٹھایئے! سر و سامانِ کربلا چلیے

سپاسِ ناموں کا دربار سجنے والا ہے
ہمارے پاس قصیدہ نہیں ہے، کیا چلیے

ادھر سے ہو کے قیامت گزرنے والی ہے
حضور! چھوڑ کے تھوڑا سا راستہ، چلیے

اتار دے گا کنارے پہ نیل کا پانی
پیمبروں کی دعا لے کے بے عصا چلیے

سروں پہ آئے تھے ہم کشتیاں اٹھائے ہوئے
یہاں تو سارا سمندر اُتر گیا، چلیے

شکستِ دل پہ بہت دیر رو لئے قیصرؔ
سمیٹ لیجئے آنکھوں میں حادثہ، چلیے

❖❖❖

○

نظر پڑے تو غزل کے مزاج دانوں کی
ہمارے شعر امانت ہیں آسمانوں کی

ہوا چلے نہ چلے لوگ انتظار میں ہیں
کھلی ہوئی ہیں ابھی کھڑکیاں مکانوں کی

ترے خلوص کو اب کیا کروں کنارے پر
سمندروں میں ضرورت تھی بادبانوں کی

ہزار زخم پرانے، ہزار زخم نئے
مرے بدن پہ نظر تھی کئی زمانوں کی

پھر اس کے بعد قصیدہ بہار کا لکھنا
اٹھا کے راکھ تو پھینک آؤ آشیانوں کی

زمین پاؤں کی زنجیر بن نہیں سکتی
تھکن مٹے تو وہی رُت ہے پھر اُڑانوں کی

ہمارے گھر کے اُجالے کہاں گئے قیصرؔ
سسک رہی ہیں لویں اب بھی شمع دانوں کی

○

کھلی ہوئی ہیں ہزار راہیں مگر ہمیں کو خبر نہیں ہے
ہمیں مسافر برہنہ پا ہیں ہمیں کو تابِ سفر نہیں ہے

سوادِ شب پھر سوادِ شب ہے تم اپنے سوزِ دروں کو دیکھو
ہوا کے جھونکوں سے کیا شکایت، چراغ ہی معتبر نہیں ہے

اُتر پڑو دردِ بیکراں میں کہ تہہ نشیں ہیں بہت زمینیں
سمندروں کو حِصار کر لو کہیں کنارا اگر نہیں ہے

جبینِ فردا پہ لکھ گیا ہے پیمبرِ وقت جاتے جاتے
شکست ہر معرکہ میں ہوگی اگر ہتھیلی پہ سر نہیں ہے

دھواں دھواں منظروں کے پیچھے بچھی ہوئی ہے بساطِ روشن
قصور کیا اس میں آئینوں کا اگر مجالِ نظر نہیں ہے

ہمارے زخموں کی بے گناہی اُلٹنے والی ہے فرشِ مقتل
لہو کہاں تک پہنچ گیا ہے، صلیب کو یہ خبر نہیں ہے

خموشیاں وِرد کر رہی ہیں گیا وہ شورِ عزا کا موسم
سکوتِ زنجیر کہہ رہا ہے کہ چیخنا اب ہنر نہیں ہے

ہوا کو ترسا کریں گے قیصرؔ قفس میں یہ اونگھتے پرندے
وہ آسمانوں پہ کیا اُڑیں گے جنھیں غمِ بال و پر نہیں ہے

❖

○

پہلے ذرا محاسبۂ ذات بھی تو ہو
دنیا پڑی ہے گھر سے شروعات بھی تو ہو

سمجھے ہیں سب انا کے دھندلکے کو روشنی
شمعیں کہاں جلاؤں کہیں رات بھی تو ہو

پنہاں ہے آنسوؤں میں سراغِ شگفتِ گل
صحرائے بے ضمیر میں برسات بھی تو ہو

اک مسئلے کے بعد نیا مسئلہ ہے روز
کچھ معتبر یہ گردشِ حالات بھی تو ہو

چہرے سے دل کا حال پڑھیں اور رو بھی لیں
جس سے ملے ہیں اس سے ملاقات بھی تو ہو

مشکل نہیں ہواؤں میں جلنے لگیں چراغ
شب زاد راستوں میں ترا ساتھ بھی تو ہو

میں تبصرہ کروں نہ خدا کی زمین پر
ٹھوکر لگے بنا گزر اوقات بھی تو ہو

لمحوں کی مٹھیوں میں ہے صدیوں کی روشنی
لیکن نظر میں وقت کی اوقات بھی تو ہو

○

وہ ایک خیمۂ شب جس کا نام دنیا تھا
کبھی دھواں تو کبھی چاندنی سا لگتا تھا

ہماری آگ بھی تاپی، ہمیں بجھا بھی دیا
جہاں پڑاؤ کیا تھا عجیب صحرا تھا

ہوا میں میری انا بھٹکتی رہی ورنہ
میں آشیانے میں برسات کاٹ سکتا تھا

جو آسمان بھی ٹوٹا، گرا مری چھت پر
مرے مکاں سے کسی بددعا کا رشتہ تھا

تم آگئے ہو خدا کا ثبوت ہے یہ بھی
قسم خدا کی! ابھی میں نے تم کو سوچا تھا

زمیں پہ ٹوٹ کے کیسے گرا غرور اس کا
ابھی ابھی تو اسے آسماں پہ دیکھا تھا

بھنور لپیٹ کے نیچے اتر گیا شاید
ابھی وہ شام سے پہلے ندی پہ بیٹھا تھا

میں شاخِ زرد کے ماتم میں رہ گیا قیصرؔ
خزاں کا زہر شجر کی جڑوں میں پھیلا تھا

❖

○

وہی شکستِ سفر کا نشاں ہے چہرے پر
بہت غبارِ پسِ کارواں ہے چہرے پر

نظر اُٹھے بھی تو زخموں کی تاب لا نہ سکے
یہ آئینہ ہے کہ خنجر رواں ہے چہرے پر

خیال و خواب کے تاجر زباں سے کچھ نہ کہیں
لکھی تمام کتابِ زیاں ہے چہرے پر

امید و بیم کی اک فصلِ رائیگاں ہوں میں
نظر میں پھول کھلے ہیں خزاں ہے چہرے پر

ملالِ جاں کی حقیقت کو کیا چھپاؤں میں
کہ حرف حرف وہی داستاں ہے چہرے پر

چلو کہ عذرِ ستم کی بھی قید ختم ہوئی
جو اک نقاب تھا وہ بھی کہاں ہے چہرے پر

پھر اس کے بعد بھی شاید ہوا چلی ہوگی
جو گرد اُڑ کے پڑی تھی، کہاں ہے چہرے پر

چھلک رہی ہے دل و جاں کی روشنی قیصرؔ
بجھی بجھی ہی سہی، مہرباں ہے چہرے پر

❖

○

بھیگتے جاگتے اک چھت کی دعا میں گزری
آج کی رات بھی بارش کی ہوا میں گزری

میں نے منہ دیکھ کے لَوٹا دیئے اوروں کے چراغ
رات ایسی جو کوئی دشتِ انا میں گزری

سانس لیتا ہوں تو زنجیر کھنک اٹھتی ہے
عمر جیسے کسی بے نام سزا میں گزری

پتھروں کا کوئی شکوہ ہے نہ زخموں کا گلہ
جو گزرنی تھی وہی کوئے وفا میں گزری

اب میسر ہو تو چپکے سے گرہ میں رکھ لوں
وہ گھڑی جو ترے دامانِ حیا میں گزری

زندگی تو بھی مرے ساتھ رہی خاک بسر
فصلِ آرائشِ گُف، خوابِ حِنا میں گزری

واہمہ تھا کہ عقیدہ تھا کہ ورثہ قیصرؔ
زندگی ایک ہی بوسیدہ قبا میں گزری

○

جہاں دھواں تھا وہیں روشنی کے داغ بھی تھے
مرے مکان کے ملبے میں کچھ چراغ بھی تھے

ذرا سی دیر میں محفل کو کیا ہوا یارب!
ابھی تو شام بھی تھی مئے بھی تھی ایاغ بھی تھے

زمین بیچ کے رہتے تھے آسمانوں پر
مرے بزرگوں میں وہ صاحبِ فراغ بھی تھے

خدا بھی دیکھ کے چُپ تھا کہ میرے دامن میں
جہاں گناہ، وہیں آنسوؤں کے داغ بھی تھے

جو ہم جلے تو دل و جاں چمک اٹھے قیصرؔ
بہت دنوں سے یہ ویرانے بے چراغ بھی تھے

❖

○

صدیوں طویل رات کے زانو سے سر اٹھا
سورج اُفق سے جھانک رہا ہے نظر اٹھا

اتنی بری نہیں ہے کھنڈر کی زمین بھی
اس ڈھیر کو سمیٹ، نئے بام و در اٹھا

ممکن ہے کوئی ہاتھ سمندر لپیٹ دے
کشتی میں سو شگاف ہوں لنگر مگر اٹھا

شاخِ چمن میں آگ لگا کر گیا تھا کیوں
اب یہ عذابِ در بدری عمر بھر اٹھا

منزل پہ آکے دیکھ رہا ہوں میں آئینہ
کتنا غبار تھا جو سر رہ گزر اٹھا

صحرا میں تھوڑی دیر ٹھہرنا غلط نہ تھا
لے گرد باد بیٹھ گیا اب تو سر اٹھا

دستک میں کوئی درد کی خوشبو ضرور تھی
دروازہ کھولنے کے لئے گھر کا گھر اٹھا

قیصؔر متاعِ دل کا خریدار کون ہے
بازار اجڑ گیا ہے دکانِ ہنر اٹھا!

❖

○

مجھے بھی دنیا شمار کر لے شناوروں میں
میں آنکھ مونڈے اتر گیا ہوں سمندروں میں

اداسیوں نے کرید ڈالا ہے آسماں کو
تم اپنے خوابوں کا رنگ بھر جاؤ منظروں میں

فصیلِ تیرہ شبی پہ اٹھ کر کمند ڈالو
چراغ کی لَو چھپائے بیٹھے ہو کیا گھروں میں

میں اُڑتے اُڑتے بکھر نہ جاؤں کہیں خدایا!
کوئی شجر دے، سکت نہیں رہ گئی پروں میں

یہ بزدلانہ منافقت ہے کہ زخم کھا کر
میں پھول تقسیم کر رہا ہوں ستمگروں میں

نہ جانے دروازہ کھول کر کب وہ کاسہ بھر دے
میں صبح سے ہی کھڑا ہوا ہوں گداگروں میں

گزرنے والے ٹھہر کے سوچیں گے کچھ تو قیصرؔ
لہو کے کچھ داغ چھوڑ آیا ہوں پتھروں میں

❖

○

دشتِ تنہائی میں کل رات ہوا کیسی تھی
دیر تک ٹوٹتے لمحوں کی صدا کیسی تھی

زندگی نے مرا پیچھا نہیں چھوڑا اب تک
عمر بھر سر سے نہ اُتری، یہ بلا کیسی تھی

سنتے رہتے تھے محبت کے فسانے کیا کیا
بوند بھر دل پہ نہ برسی یہ گھٹا کیسی تھی

کیا ملا فیصلۂ ترکِ تعلق کر کے
تم جو بچھڑے تھے تو ہونٹوں پہ دعا کیسی تھی

ٹوٹ کر خود جو وہ بکھرا ہے تو معلوم ہوا
جس سے لپٹا تھا وہ دیوارِ اَنا کیسی تھی

جسم سے نوچ کے پھینکی بھی تو خوشبو نہ گئی
یہ روایات کی بوسیدہ قبا کیسی تھی

ڈوبتے وقت بھنور پوچھ رہا ہے قیصرؔ
جب کنارے سے چلے تھے تو فضا کیسی تھی

❖

○

ہم وقت کے الاؤ میں برسوں جلے میاں
لو! دل کی راکھ چھوڑ کے ہم بھی چلے میاں

چاروں طرف سے ٹوٹ رہا ہے ہوا کا شور
بستی میں اک چراغ کہاں تک جلے میاں

اک دوسرے کے قتل میں ہم سب شریک ہیں
پوچھو تو کوئی نام کسی کا نہ لے میاں

دروازہ بند کر کے سلگنا پڑا مجھے
کیوں میرے گھر کی آگ سے بستی جلے میاں

کب تک کھڑے رہو گے درختوں کی آڑ میں
کیا جانے کتنی دیر یہ آندھی چلے میاں

وہ دن گئے کہ رہتے تھے ہم آسمان پر
کٹتی ہے رات ٹوٹی ہوئی چھت تلے میاں

قیصرؔ! بھری بہار سے روٹھے رہے بہت
اب فصل جا رہی ہے، لگا لو گلے میاں

❖❖❖

○

یہ خواب جو ہم سفر ہیں میرے
قاتل ہیں کہ چارہ گر ہیں میرے

وہ سامنے آسماں ہے لیکن
بھیگے ہوئے بال و پر ہیں میرے

میں شمع کہاں کہاں جلاؤں
بستی کے تمام گھر ہیں میرے

میرے لئے کتنی دیر روئیں
یہ لوگ، جو چارہ گر ہیں میرے

یہ شام کہاں سے آ رہی ہے
مہکے ہوئے بام و در ہیں میرے

پھسلا تو گروں گا آسماں پر
پاؤں ایسی زمین پر ہیں میرے

دریا نے بہت دیا ہے قیصرؔ
کشتی نہ سہی، بھنور ہیں میرے

❖

○

عہدِ جنوں میں بیٹھے بیٹھے جو غزلیں لکھ ڈالی تھیں
ہم کو رسوا، دنیا بھر کو پاگل کرنے والی تھیں

آنکھوں میں وہ شام کا ٹکڑا اکثر چُبھتا رہتا ہے
گھر میں آندھی جب آئی تھی، شمعیں جلنے والی تھیں

چاند ستارے ٹوٹ رہے تھے خوابوں کی انگنائی میں
آنکھ کھلی تو دیکھا، گھر کی سب دیواریں کالی تھیں

چٹکی بھر امید نہیں تھی کاسہ لے کر کیا پھرتے
شہرِ وفا کی ساری گلیاں اپنی دیکھی بھالی تھیں

پیار کا موسم بیت چکا تھا بستی میں جب پہونچے ہم
لوگوں نے پھولوں کے بدلے تلواریں منگوالی تھیں

قیصؔر دل کا حال سنا کر جب یاروں کا مُنھ دیکھا
سب کے چہرے سوکھے سب کی آنکھیں خالی تھیں

❖

○

جو بات ہوئی، ہو گئی پاگل نہ بنو تم
اتنا بھی نہ روٹھو کہ منائے نہ منو تم

تھوڑی سی زمیں باندھ کے پردیس نکلتے
کاٹو گے کہاں رات مرے بے وطنو! تم

اس طرح سمولوں میں تمہیں اپنی غزل میں
جب شعر پڑھے کوئی تو کاغذ سے چھنو تم

چھو کے تمہیں دیکھوں کہیں پتھر تو نہیں ہو
اے گل بدنو! گل بدنو! گل بدنو! تم

ہونے دو جو برباد ہوئی عمر ہماری
آباد رہو اے مرے وعدہ شکنو! تم

دیوانے ہو قیصرؔ تو کرو گھر میں نمائش
یوں شہر کی گلیوں میں تماشا نہ بنو تم

○

دل پہ جو گزرے ہے سب جانے ہے
وہ اداسی کا سبب جانے ہے

مر مٹے ہوتے کبھی کے تم پر
عشق تھوڑا سا ادب جانے ہے

ہم سے نظریں نہ چراؤ صاحب!
کون افسانۂ شب جانے ہے

کیا ضروری ہے زباں سے کہنا
وہ مرا حسنِ طلب جانے ہے

دل ہے کچھ سوچ کے زندہ ورنہ
جان کھونے کا بھی ڈھب جانے ہے

حالِ دل اور چھپاؤ قیصرؔ
جو نہ جانے تھا وہ اب جانے ہے

❖

○

تم سے بچھڑ گئے تو کسی سے ملے نہ ہم
مل بھی لئے کسی سے تو جی سے ملے نہ ہم

وہ آنسوؤں کو اپنی ہنسی میں چھپا گیا
جس سے گلے ملے تھے اسی سے ملے نہ ہم

برسوں کے بعد آئے تو دنیا بدل گئی
اپنی گلی میں، اپنی گلی سے ملے نہ ہم

دل کو وہ غم ملا ہے محبت کے نام پر
اس بے وفا کے بعد کسی سے ملے نہ ہم

کچھ اس طرح سے غم کا نشہ راس آ گیا
آئی کبھی خوشی تو خوشی سے ملے نہ ہم

قیصرؔ ہوئی نہ ہم سے دکھاوے کی دوستی
کاغذ کے پھول لے کے کسی سے ملے نہ ہم

❖

○

خوابوں کے کسی موڑ پہ دیکھا سا لگے ہے
اپنا نہ سہی پھر بھی وہ اپنا سا لگے ہے

اے شدّتِ گریہ! کہیں دل ڈوب نہ جائے
یہ درد کا لمحہ مجھے دریا سا لگے ہے

جس موڑ پہ بچھڑے تھے ہمیشہ کے لئے ہم
دل ہے کہ اسی موڑ پہ ٹھہرا سا لگے ہے

آنکھوں میں بسی ہے کوئی کھوئی ہوئی خوشبو
جس پھول کو دیکھو، وہی چہرا سا لگے ہے

برسوں سے کسی کے لئے روئے بھی نہیں ہم
کیوں زخمِ تمنا ہے کہ تازہ سا لگے ہے

تم ڈوبتے سورج کے لئے روؤ ہو قیصرؔ
کچھ دیر میں سایہ بھی بچھڑتا سا لگے ہے

○

(پاکستانی دوستوں کے نام)

درد کی داستاں لئے پھرئیے!
اپنے آنسو کہاں لئے پھرئیے!

شہر بھی دشت ہو گیا یارو!
خیمۂ جسم و جاں لئے پھرئیے

کون جنسِ وفا خریدتا ہے
سر پہ ساری دُکاں لئے پھرئیے

کیسا دامن، رفوگری کیسی
جایئے! دھجیاں لئے پھرئے

اک ستارہ نظر نہیں آتا
شام، بے آسماں لئے پھرئے

ان بتوں سے بڑی شکایت تھی
اب خدا کو وہاں لئے پھرئے

جل گئے ہوتے آشیاں کی طرح
عمر بھر اب دھواں لئے پھرئے

ہائے کیا لوگ کھو گئے قیصرؔ
اب غمِ رفتگاں لئے پھرئے

○

بارش کی ہوائیں کاٹیں گی، دیوار میں دَر ہو جائے گا
کچھ روز جو تالے بند رہے گھر خود ہی کھنڈر ہو جائے گا

اے ضبطِ محبت! رہنے دے اس درد کی یہ تقدیر کہاں
ٹپکے گا نہ ان کے دامن پر، آنسو بھی اگر ہو جائے گا

برسا تھا چمن میں جتنا لہو پیڑوں کی جڑوں میں بیٹھ گیا
جو پھول کھلے گا اب کے برس، آشوبِ نظر ہو جائے گا

بیدرد ہوا کی سازش ہے، تم خود کو بکھرنے مت دینا
راہیں بھی نہ اس کو پُوچھیں گی جو گردِ سفر ہو جائے گا

تم وقت کے اندھے دریا میں پتوار بنا لو لہروں کو
طوفان سے ڈر کر بھاگے تو، ساحل بھی بھنور ہو جائے گا

تہذیب کے بام و دَر سے کہو بُجھنے کے لئے تیار رہیں
جس چاند سے دنیا روشن ہے، کل داغِ سحر ہو جائے گا

❖

○

تیشہ تو چلاتے ہیں مگر بے ہنری سے
شکوہ ہے مجھے یاروں کی اس کم نظری سے

آنکھوں سے دھواں پونچھ کے دیکھو مرا چہرا
تصویر کو رسوا نہ کرو بے بصری سے

نادیدہ ہواؤں سے چراغ اپنا بچاؤ
شب خون نہ پڑ جائے کہیں بے خبری سے

پڑھ پائیں مری آگ کو کیا برف بدن لوگ
جل جاتا ہے کاغذ مری شعلہ جگری سے

الہام کا ٹکڑا ہے مرا حرفِ بشارت
رشتہ ہے مرے نطق کا پیغامبری سے

میں خاک اڑاؤں کہ عزیزوں کو دعا دوں
اک شہر پریشاں ہے مری دربدری سے

قیصرؔ مری آواز سے اُڑتا ہے اُجالا
احساسِ شبِ غم ہے چراغِ سحری سے

○

جانے کس زُعم میں رقاصۂ تدبیر بھی ہے
وقت کے ہاتھ میں گھنگھرو بھی ہے، زنجیر بھی ہے

اس طرح بھی مرے دل کو نظر انداز نہ کر
اس کھنڈر میں تری بے رنگ سی تصویر بھی ہے

فیصلہ پڑھ کے میں مجرم کی طرح بیٹھا ہوں
ایک گوشے میں ترے ہاتھ کی تحریر بھی ہے

جو ملا ہے وہی بچوں کو بھی دیتا جاؤں
یہ محبت مرا ورثہ بھی ہے جاگیر بھی ہے

درد پڑھ لے مرے پتھرائے ہوئے ہونٹوں پر
یہ خموشی مری روداد کی تفسیر بھی ہے

دل کھنچا جاتا ہے نادیدہ اجالوں کی طرف
کوئی خورشید پسِ پردۂ تقدیر بھی ہے

تیری گُل رنگ ہتھیلی پہ نظر تھی میری
کیا خبر تھی تری چٹکی میں کوئی تیر بھی ہے

ٹھوکریں کھانے کو آسان نہ جانو قیصرؔ
اس میں کچھ ضد ہے تو کچھ خوبیِ تقدیر بھی ہے

○

مری آنکھوں میں ڈوبے خواب کتنے
ندی میں آگئے سیلاب کتنے

عبادت اپنی چٹکی بھر نہیں تھی
سجائے منبر و محراب کتنے

مری مٹھی میں جگنو تک نہیں ہے
ترے آنگن میں ہیں مہتاب کتنے

جنہیں میں پھینک آیا راستے میں
وہ لمحے ہو گئے نایاب کتنے

زمیں سے ایک پودا کیا اُگا ہے
کھنڈر لگنے لگے شاداب کتنے

دعائیں بادباں میں باندھ رکھیو
سمندر میں ملیں گرداب کتنے!

نہیں جاتی اُن آنکھوں کی اُداسی
سجا آیا میں جھوٹے خواب کتنے

مسلسل آ رہے ہیں گھر میں پتھر
پسِ دیوار ہیں احباب کتنے

○

اس دور میں آسان نہ ہو کارِ رفو تو
رِستا ہی چلا جائے اگر دل کا لہو تو

یوں منہ نہ لگائے گی شہادت گہِ فردا
کر آؤ ذرا خونِ رگِ جاں سے وضو تو

ہم پھول لئے پھرتے ہیں از راہِ محبت
تلوار اٹھائے ہوئے پھرتا ہو عدو تو

وحشت مجھے دروازے سے ہٹنے نہیں دیتی
اے جانِ غزالاں! ادھر آجاؤ کبھو تو

ہم ناؤ لئے بیٹھے ہیں خوابوں کے کنارے
وہ چاند سرِ شام نہ نکلے لبِ جُو تو

معیارِ حقیقت مجھے معلوم ہے قیصرؔ
شاعر کے مقدر ہی میں لکھا ہو غلو تو

❖

○

جو راستے سے بھی گزریں انھیں حبیب رکھوں
دیا جلاؤں تو دہلیز کے قریب رکھوں

مرا خلوص پشیماں ہے میری فطرت سے
وہ مجھ سے دُور کھنچیں، میں انھیں قریب رکھوں

کسی کے دل میں جگہ ہو تو بوجھ بانٹوں بھی!
کہیں زمین نہیں ہے، کہاں صلیب رکھوں

کبھی مزاج نہ پوچھوں، کبھی لگاؤں گلے
میں زندگی سے مراسم بڑے عجیب رکھوں

بدن سے لَو تو اٹھے، روشنی تو ہو قیصرؔ
ہوا کے رُخ پہ سلگتا ہوا نصیب رکھوں

❖

○

مرے ہاتھ میں عشق کا ساز دے کر
تمھیں چھپ گئے ایک آواز دے کر

یہ کیوں کر دیا پتھروں کے حوالے
مجھے فطرتِ آئینہ ساز دے کر

یہ کس نے اٹھا کر قلم رکھ دیا ہے
کہانی کو اک حرفِ آغاز دے کر

ہوا میں بھٹکتے پھریں اب پرندے
زمیں ہٹ گئی، زُعمِ پرواز دے کر

سفر پر نکلنا ہے جس کو وہ جاگے
ٹھہرتا نہیں وقت، آواز دے کر

غزل سادہ کاغذ پہ آنسو لکھے گی
چلا جاؤں گا اپنا انداز دے کر

نہ جانے کہاں اُڑ گئی عمر قیصرؔ
کھڑا ہوں بیاباں میں آواز دے کر

○

ساری دنیا کے تعلّق سے جو سوچا جاتا
آدمی اتنے قبیلوں میں نہ بانٹا جاتا

دل کا احوال نہ پوچھو کہ بہت روز ہوئے
اس خرابے کی طرف میں نہیں آتا جاتا

زندگی تشنہ دہانی کا سفر تھی شاید
ہم جدھر جاتے اُسی راہ پہ صحرا جاتا

شام ہوتے ہی کوئی شمع جلا رکھنی تھی
جب دریچے سے ہوا آتی تو دیکھا جاتا

روشنی اپنے گھروندوں میں چھپی تھی ورنہ
شہر کے شہر پہ شب خون نہ مارا جاتا

سارے کاغذ پہ بچھی تھیں مری آنکھیں قیصرؔ
اتنے آنسو تھے کہ اک حرف نہ لکھا جاتا

○

وہ حجاباتِ نظر کیا جو نظر طے کر لے
آسمانوں ہی پہ رہ جائے اگر طے کر لے

اجنبی شہر میں برسات کہاں گزرے گی
چھپ کے رونے کے لئے کوئی کھنڈر طے کر لے

اس طرح بیٹھ کے کیا سوچ رہے ہو یارو!
وقت اتنے میں نہ صدیوں کا سفر طے کر لے

خود گرید ے گا اگر اپنی جڑوں کی مٹی
اپنے گرنے کا ٹھکانہ بھی شجر طے کر لے

اب کسی اور پہ یہ رات نہ برسے یا رب!
ڈوبنا مجھ کو گوارا ہے مگر طے کر لے

ہم تو جلتی ہوئی بستی کے مہاجر ٹھہرے
اب کہاں جانا ہے، یہ راہ گزر طے کر لے

پار ہونے کی تمنا میں سبھی بیٹھے ہیں
کس کو ساحل سے لگانا ہے، بھنور طے کر لے

کچی مٹی کا کنواں، ساتھ نہیں چھوڑے گا
آدمی سات سمندر کا سفر طے کر لے

اتنے بے صرفہ نہیں نیند کے جھونکے قیصر
سوتے سوتے ہی کوئی خوابِ سحر طے کر لے

○

دن کی بے درد تھکن چہرے پہ لے کر مت جا
بام و در جاگ رہے ہوں گے، ابھی گھر مت جا

میرے پُرکھوں کی وراثت کا بھرم رہنے دے
تو حویلی کو کھلا دیکھ کے اندر مت جا

بوند بھر درد سنبھلتا نہیں کم ظرفوں سے
رکھ کے تو اپنی ہتھیلی پہ سمندر مت جا

پھوٹنے دے مری پلکوں سے ذرا اور لہو
اے مری نیند! ابھی چھوڑ کے بستر مت جا

کچھ تو رہنے دے ابھی ترکِ وفا کی خاطر
تجھ کو جانا ہے تو جا، ہاتھ جھٹک کر مت جا

اور کچھ دیر یہ مشقِ نگہ ناز سہی
سامنے بیٹھ، ابھی پھینک کے خنجر مت جا

دھوپ کیا ہے تجھے اندازہ نہیں ہے قیصرؔ
آبلے پاؤں میں پڑ جائیں گے باہر مت جا

❖

○

ہم بھی اپنے شہر میں یارو! پھرتے تھے فرہاد بنے
کیا کیا عشق رچایا برسوں لکھیں تو روداد بنے

جن آنکھوں کو پڑھتے پڑھتے غزلیں کہنا سیکھ گئے
اب ان آنکھوں کے افسانے بھولی بسری یاد بنے

سارے پنچھی پنکھ سمیٹے ڈالی ڈالی بیٹھے ہیں
جس کا جی ہو جال بچھائے، جو چاہے صیّاد بنے

شاہ جہاں کا تاج محل ہو یا جوگی کی کٹیا ہو
سپنوں کے ہر روپ نگر کی مٹّی ہی بنیاد بنے

غزلیں کہنا سہل نہ جانو یہ لفظوں کا کھیل نہیں
برسوں ہم نے زہر پیا ہے شاعر اس کے بعد بنے

قیصرؔ میری غزلیں آخر کس کے غم میں ڈوبی ہیں
جب کاغذ پر لکھ کر دیکھوں ہر نغمہ فریاد بنے

○

اگر اندھے کنویں میں مجھ کو تنہا چھوڑ دینا تھا
تو پھر اے زندگی! آواز دینا چھوڑ دینا تھا

دھواں اب عمر بھر پونچھا کرو تم اپنے چہرے سے
چراغِ دل جلایا تھا تو جلتا چھوڑ دینا تھا

اُبھرنا، ڈوبنا جو کچھ بھی ہونا ہے یہیں ہوگا
اگر موجوں سے ڈرنا تھا تو دریا چھوڑ دینا تھا

حیاتِ جاوداں کہتی ہے یوں مرتے ہیں دل والے
دہانِ زخم کہتے ہیں کہ رستہ چھوڑ دینا تھا

ترا دستِ ہوس شامل نہیں قتلِ محبت میں
مرے بھائی! مجھی کو اپنا حصہ چھوڑ دینا تھا

بزرگوں کو خبر تھی دھوپ کے دن آنے والے ہیں
سبھی بیچا تھا، اک دو پیڑ سایہ چھوڑ دینا تھا

بہت ہوتا، ہوا کے ساتھ آتی گرد بھی قیصرؔ
مگر دیوار میں کوئی دریچہ چھوڑ دینا تھا

○

محبت قطرہ قطرہ روز چکھنا چاہتا ہوں میں
پرانے دوستوں کو یاد رکھنا چاہتا ہوں میں

نہ توڑا جا سکا دنیا سے میرے دل کا آئینہ
تمہارے ہاتھ کے پتھر پرکھنا چاہتا ہوں میں

لگی ہیں ٹھوکریں اتنی کہ اب چلنا بھی مشکل ہے
سنبھال اے منزلِ جاناں کہ تھکنا چاہتا ہوں میں

کہیں سے مانگ لا اے بے بسی! پردہ تبسم کا
وہ آئے ہیں تو دل کا زخم ڈھکنا چاہتا ہوں میں

مری آنکھوں میں آ کر رک گئی ہیں درد کی لہریں
ذرا دامن بچانا اب چھلکنا چاہتا ہوں میں

مرے آنسو کسی کے دل کو پگھلانے چلے قیصر
سمندر پر مکاں کی نیو رکھنا چاہتا ہوں میں

❖

○

دل توڑ کے راہوں میں بکھرا دئے جاتے ہیں
جو ٹوٹ نہیں سکتے ٹھکرا دئے جاتے ہیں

کہتے ہیں تمنائیں شاید انھیں پھولوں کو
جو توڑ کے قبروں پر بکھرا دئے جاتے ہیں

جڑ کتنی بھی گہری ہو مشکل ہے کھڑے رہنا
جو پیڑ نہیں پھلتے کٹوا دئے جاتے ہیں

چھت ڈھونڈنے نکلے ہو؟ اب دھوپ کے موسم میں
دیوار کے سائے بھی ہٹوا دئے جاتے ہیں

دروازے پہ لکھی ہے رسم و رہِ میخانہ
جو دیر سے آتے ہیں ترسا دئے جاتے ہیں

غیرت کا تقاضا ہے کٹ جائیں تو اچھا ہے
وہ ہاتھ جو راہوں میں پھیلا دئے جاتے ہیں

قیصرؔ مری بستی میں آتے ہیں اگر بادل
شاداب زمینوں پر برسا دئے جاتے ہیں

○

مرے خدا! مری قیدِ حیات کم کر دے
چراغ دے نہیں سکتا تو رات کم کر دے

کبھی تو میری طرح حوصلہ نہیں رکھتے
ستونِ دار کو دو چار ہاتھ کم کر دے

مرے وجود کی قیمت اگر پرکھنی ہے
یہ کائنات اٹھا، میری ذات کم کر دے

میں آدمی کے قصیدے کو بند کرتا ہوں
ذرا سا تو بھی فرشتوں کی بات کم کر دے

ترے خلوصِ مسلسل سے جی نہ بھر جائے
کبھی کبھی نگہ التفات کم کر دے

یہ روز روز نئی کربلائیں کیسی ہیں؟
مری زمین سے داغِ فُرات کم کر دے

❖

○

یہ عمر بھر کا روگ ابھی مت خریدئے
دامن نصیب ہو تو محبت خریدئے

رشتوں کے کاروبار میں کچھ فائدہ نہیں
دل بیچئے تو زخمِ ملامت خریدئے

سورج کو اس درخت سے ہٹ جانے دیجئے
پچھتایئے گا! چھاؤں ابھی مت خریدئے

آوارگی کو ضد کہ بہت ہے یہ آسماں
موسم کا فیصلہ کہ کوئی چھت خریدئے

پھیلی ہے دھوپ رات کے دریا کے اُس طرف
پانی سے جایئے تو حرارت خریدئے

میں زہر بیچتا ہوں تو اچھا ہے، جایئے
جھوٹے پیمبروں سے بشارت خریدئے

گیلی زمیں پہ نام نہ تحریر کیجیے
پتھر پہ جو لکھی ہو وہ شہرت خریدئے

قیصؔر بڑی حسین امانت ہے زندگی
دنیا کو بددعا کی طرح مت خریدئے

○

آنکھ کھُل جائے تو دستک کو ٹٹولا جائے
ایک آواز پہ دروازہ نہ کھولا جائے

وقت جنگل میں شکاری کی طرح بیٹھا ہے
آ لگے تیر جو دھیرے سے بھی بولا جائے

خیمۂ شب میں پڑے ہیں یونہی ہجرت زدہ لوگ
سروسامانِ سفر کیا ہے جو کھولا جائے

پرسشِ حال کی ضد آن پڑی ہے اُس کو
اپنا یہ حال کہ دو لفظ نہ بولا جائے

ہم تو پی پی کے، بدن کر چکے نیلا اپنا
اب نئی نسل میں یہ زہر نہ گھولا جائے

یہی دن بھر کی گدائی کا صلہ ہے قیصرؔ
سب سے پہلے مری گٹھری کو ٹٹولا جائے

❖

○

خنجر کے ڈر سے اپنی زباں کھولتا بھی کون
میں قتل ہو رہا تھا مگر بولتا بھی کون

تہذیب گفتگو کا زمانہ گزر گیا
سب کی زباں میں زہر تھا رس گھولتا بھی کون

بازار اٹھ گیا، میں دکاں میں پڑا رہا
دل جنسِ رائیگاں تھا اسے تولتا بھی کون

دیوار و در کا داغ تھی آوارگی مری
دروازہ اٹھ کے میرے لئے کھولتا بھی کون

دو بوند آنسوؤں میں کہانی تمام تھی
میرے سوا یہ نرم زباں بولتا بھی کون

موسم کے انتظار میں تھا آشیاں عزیز
ایسی ہوائے تند میں پر تولتا بھی کون

سارے ذہین لوگ مروت پسند تھے
قیصر کی شاعری پہ زباں کھولتا بھی کون

❖❖

○

آنے والے دور کے لوگو! ہم تو اپنی سی کر گزرے
دنیا تم کو سونپ چلے ہیں، تم جانو جو تم پر گزرے

حرف تسلی لکھتے جائیں دیواروں پر اپنے لہو سے
ہم جو قصہ جھیل رہے ہیں ممکن ہے کل گھر گھر گزرے

زخم بھرے تو برسوں بیتے، چُبھتے ہیں احساس میں اب تک
آنکھوں میں جو بیٹھ گئے ہیں ایسے بھی کچھ منظر گزرے

کس موسم میں آئیں گے اب گلے لگا کر رونے والے
بھیگی بھیگی ایک تمنا، دل کی طرف سے اکثر گزرے

ساحل ساحل ریت بچھی ہے، اپنی پیاس کہاں لے جائیں
ہم سے پہلے آنے والے سارا دریا پی کر گزرے

دل ٹوٹے یا چہرا ٹوٹے باہر تک آواز نہ جائے
دیواریں بھی دیکھ نہ پائیں جو کچھ گھر کے اندر گزرے

قیصرؔ میں اک رات کا شاعر میری آنکھیں راکھ ہوئی ہیں
جانے کتنا جاگے ہونگے' جتنے پیر پیمبر گزرے

❖❖❖

○

ہم نے لکھے تھے ہواؤں میں فسانے اپنے
اُڑ گئے ایک ہی جھونکے میں زمانے اپنے

سونی آنکھوں میں تلاشو نہ وفا کے موتی
ہم لٹا آئے کہیں اور خزانے اپنے

بند پلکوں پہ یہ کس درد نے دستک دی ہے
ٹوٹ جائیں نہ کہیں خواب سہانے اپنے

ہم دریچے پہ کھڑے ہو کے کہاں تک سوچیں
چاند ہر روز بدلتا ہے ٹھکانے اپنے

کون پروانہ بنے، کون جلے کس کے لئے
شمع خود بیٹھ کے اب روئے سرہانے اپنے

ہم نے توڑا نہیں ماضی سے تعلق قیصرؔ
ہر نئے شعر میں آنسو ہیں پرانے اپنے

❖

○

کیا کیا پھول سے لمحوں کو گنواتے کے سِوا
پتّیاں نوچ کے پانی میں بہاتے کے سِوا

رات، پل بھر کے لئے گھر میں ہَوا آئی تھی
کام ہی کیا تھا اُسے شمع بجھانے کے سِوا

زندگی! تو مرے چہرے پہ ہنسے یا روئے
میں کہاں جاؤں ترے آئینہ خانے کے سِوا

کوچۂ یار! تری قدر شناسی تسلیم!
کر سکے کچھ نہ ہمیں خاک اُڑانے کے سِوا

سب کے چہرے پہ رہیں پشت کی جانب آنکھیں
کوئی رستہ نہ رہا ٹھوکریں کھانے کے سِوا

ہم نے انسان کی تاریخ پڑھی ہے قیصرؔ
دل نہ پایا کہیں پتھر کے زمانے کے سِوا

❖

○

ہَوا کو شمع بُجھانے کا حوصلہ تو نہ تھا
کہیں یہ دامنِ جاناں کا فیصلہ تو نہ تھا

ہمیں سمجھ نہ سکے شرطِ آرزو ورنہ
تمام عمر نہ کٹتا وہ فاصلہ تو نہ تھا

بڑے سکوں سے گزرتی تھی آسمان تلے
وہاں، یہ چھت کے ٹپکنے کا مسئلہ تو نہ تھا

تمام رات مجھے بستیوں نے دوُر رکھا
کہیں میں خانہ بدوشوں کا قافلہ تو نہ تھا

کسی کے سامنے مٹھی کبھی نہیں کھولی
کہ زخمِ جاں تھا، ہتھیلی کا آبلہ تو نہ تھا

مجھے ہواؤں سے کوئی گلہ نہیں قیصر
مگر یہ ناؤ ڈبونے کا مرحلہ تو نہ تھا

❖

○

میں ہزار بار چاہوں کہ وہ مسکرا کے دیکھے
اسے کیا غرض پڑی ہے جو نظر اٹھا کے دیکھے

مرے دل کا حوصلہ تھا کہ ذرا سی خاک اُڑا لی
مرے بعد اس گلی میں کوئی اور جا کے دیکھے

کہیں آسمان ٹوٹا تو قدم کہاں رکیں گے
جسے خواب دیکھنا ہو وہ زمیں پہ آ کے دیکھے

اُسے کیا خبر کہ کیا ہے یہ شکستِ عہد و پیماں
جو فریب دے رہا ہے وہ فریب کھا کے دیکھے

ہے عجیب کشمکش میں مری شمعِ آرزو بھی
میں جلا جلا کے دیکھوں، وہ بجھا بجھا کے دیکھے

اُسے دیکھنے کو قیصرؔ میں نظر کہاں سے لاؤں
کہ وہ آئینہ بھی دیکھے تو چھپا چھپا کے دیکھے

❖

○

کسی دکھ کا بھی دکھ ہوتا نہیں اب
ہنسو مجھ پر کہ میں روتا نہیں اب

بہت دن پاؤں کے چھالوں پہ روئے
ہمیں احساس بھی ہوتا نہیں اب

چٹانیں سب کے کاندھوں پر رکھی ہیں
کسی کا غم کوئی ڈھوتا نہیں اب

ہمارا خون اور اندھوں کی بستی!
یہاں دامن کوئی دھوتا نہیں اب

بدن اندر سے مٹی ہو چکا ہے
جلے جاؤ! دھواں ہوتا نہیں اب

کئی صدیاں تو آنکھوں میں بتا دیں
میں کب سوتا اگر سوتا نہیں اب

ہوا نے بام و در شل کر دیے ہیں
دریچہ کوئی وا ہوتا نہیں اب

ہمیں کو رائیگاں ہونا تھا قیصرؔ
کوئی یوں زندگی کھوتا نہیں اب

❖

○

وہ بے خودی ہے کہ مشکل سے اعتبار کروں
تم آ بھی جاؤ تو کچھ دیر انتظار کروں

کہو تو رات کی چادر بچھا کے سو جاؤں
کہو تو چاند نکلنے کا انتظار کروں

ہزار خواب ہیں جو ٹوٹتے بکھرتے ہیں
میں ایک نیند میں کیسے یہ رات پار کروں

گزر گیا ہوں ترے انتظار کی حد سے
یہ موڑ وہ ہے جہاں خود کا انتظار کروں

مرے جنوں، مری آوارگی پہ طنز نہ کر
میں کیا کروں جو گریباں نہ تار تار کروں

صدائے تیشہ سنائی تو دی مگر قیصرؔ
لہو کہاں جو چٹانوں کو لالہ زار کروں

○

ہر شمع بجھی رفتہ رفتہ، ہر خواب لُٹا دھیرے دھیرے
شیشہ نہ سہی، پتھر بھی نہ تھا، دل ٹوٹ گیا دھیرے دھیرے

برسوں میں مراسم بنتے ہیں، پل بھر میں بھلا کیا ٹوٹیں گے
تو مجھ سے بچھڑنا چاہے تو دیوار اٹھا دھیرے دھیرے

دل کیسے جلا، کس وقت جلا، ہم کو بھی پتہ مشکل سے چلا
پھیلا ہے دھواں چپکے چپکے، بھڑکی ہے چِتا دھیرے دھیرے

احساس ہوا بربادی کا جب سارے مکاں میں دھول اڑی
آئی ہے ہمارے آنگن میں، پت جھڑ کی ہوا دھیرے دھیرے

بیتابیٔ دل سے گھبرا کر احسانِ مسیحا کیا لیتے
بھرنا ہے تو خود بھر جائے گا یہ زخمِ وفا دھیرے دھیرے

باقی ہے بہت کچھ ہونے کو، اک عمر پڑی ہے رونے کو
اٹھ اٹھ کے نہ تڑپا اتنا بھی، اے درد! ذرا دھیرے دھیرے

ہم بھول گئے تھے قیصرؔ جی! کس وعدہ شکن کا وعدہ تھا
جب شام کے سائے ڈوب گئے، کچھ یاد پڑا دھیرے دھیرے

❖

○

مزا جینے میں کیا آتا جو دل کے زخم بھر جاتے
بچھڑ کے تم سے ہم دو دن جئے ہوتے تو مر جاتے

اُداسی بال بکھرائے ہوئے دروازہ کھولے گی
ہمارے پاؤں اکثر لڑکھڑا جاتے ہیں گھر جاتے

ہم ایسے پھول تھے جن کو مزاروں پر بکھرنا تھا
اگر توڑے نہیں جاتے تو خود ہی ٹوٹ کر جاتے

محبت ایک نوحہ بن گئی ہے، زندگی آنسو
اگر یہ دن تمہیں بھی دیکھنا پڑتا تو ڈر جاتے

نہ بازاروں میں قیمت تھی، نہ محفل میں پذیرائی
ہم اپنے دل کا ٹوٹا آئینہ لے کر کدھر جاتے

وہ کیا جانیں مراسم کا نبھانا کس کو کہتے ہیں
ہمیں ملتے اگر ملتے، ہمیں جاتے اگر جاتے

ہماری پیاس تھی جس نے ہمیں زندہ رکھا قیصرؔ
اگر دریا ملا ہوتا تو ہم ساحل پہ مر جاتے

❖❖❖

○

مدت گزر گئی ہے مگر بھولتی نہیں
چھوٹی سی ایک بات جواب یاد بھی نہیں

آوارہ پھر کے دیکھ لیا رات رات بھر
اس کی گلی کے بعد کہیں روشنی نہیں

آنکھوں میں چُبھ رہا ہے ترے ہجر کا دھواں
یہ آگ کب لگی تھی، ابھی تک بجھی نہیں

ایسے بھنور میں چھوڑ کے تم بھی چلے گئے
پھر زندگی کی ناؤ کنارے لگی نہیں

لے جائیگی تمام اجالے سمیٹ کے
کس کے چراغ ہیں یہ ہوا پوچھتی نہیں

اک فیصلے پہ آؤ کہ کچھ بات تو بنے
یہ کوئی بات ہے کہ کبھی ہاں، کبھی نہیں

قیصرؔ کبھی وہ آئیں تو دل کی یہ دھڑکنیں
ایسی غزل سنائیں جو اب تک لکھی نہیں

❖

○

تری بے وفائی کے بعد بھی مرے دل کا پیار نہیں گیا
شب انتظار گزر گئی، غمِ انتظار نہیں گیا

میں سمندروں کا نصیب تھا مرا ڈوبنا بھی عجیب تھا
مرے دل نے مجھ سے بہت کہا، میں اُتر کے پار نہیں گیا

تو مرا شریکِ سفر نہیں مرے دل سے دور مگر نہیں
تری مملکت نہ رہی مگر ترا اختیار نہیں گیا

اسے اتنا سوچا ہے روز و شب کہ سوال دید رہا نہ اب
وہ گلی بھی زیرِ طواف ہے جہاں ایک بار نہیں گیا

کبھی کوئی وعدہ وفا نہ کر، یونہی روز روز بہانہ کر
تو فریب دے کے چلا گیا ترا اعتبار نہیں گیا

مجھے اس کے ظرف کی کیا خبر کہیں اور جا کے ہنسے اگر
مرے حالِ دل پہ تو روئے بن کوئی غم گُسار نہیں گیا

اسے کیا خبر کہ شکستگی، ہے جنوں کی منزلِ آگہی
جو متاعِ شیشۂ دل لئے سرِ کوئے یار نہیں گیا

مری زندگی، مری شاعری کسی غم کی دین ہے جعفری
دل و جاں کا قرض چکا دیا میں گناہگار نہیں گیا

○

آج برسوں میں تو قسمت سے ملاقات ہوئی
آپ مُنھ پھیر کے بیٹھے ہیں یہ کیا بات ہوئی

اُڑ گئی خاکِ دل و جاں تو وہ رونے بیٹھے
بستیاں جل گئیں جب ٹوٹ کے برسات ہوئی

تم مرے ساتھ تھے جب تک تو سفر روشن تھا
شمع جس موڑ پہ چھوٹی ہے وہیں رات ہوئی

اس محبت سے ملا ہے وہ ستمگر ہم سے
جتنے شکوے نہ ہوئے اتنی مدارات ہوئی

ایک لمحہ تھا عجب اس کی شناسائی کا
کتنے نادیدہ زمانوں سے ملاقات ہوئی

قتل ہو جاتی ہے اس دور میں دل کی آواز
مجھ پہ تلوار نہ ٹوٹی یہ کرامات ہوئی

گاؤں کے گاؤں بجھانے کو ہوا آئی تھی
میرے معصوم چراغوں سے شروعات ہوئی

شاعری پہلے رسولوں کی دعا تھی قیصرؔ
آج اس عہد میں اک شعبدۂ ذات ہوئی

❖

○

ہر وقت وہی کوچۂ جاناں ہے وہی ہم
پاگل کوئی کہتا ہے تو پاگل ہی سہی ہم

پرکھا ہے تو کہتے ہیں تمہیں وعدہ فراموش
تم جانو ہو، کہتے نہیں اوروں کی کہی ہم

تم آئے ہو، آتا نہیں آنکھوں پہ بھروسہ
اللہ! دعا مانگتے بیٹھے تھے یہی ہم

دو بوند محبت کو بھی ترسائے رکھا ہے
بھولے ہیں نہ بھولیں گے تری کم نگہی ہم

اسلاف کے کچھ نام تو چہرے پہ لکھے ہیں
ویرانے میں ٹوٹی ہوئی دیوار سہی ہم

دیکھ آئے ترے حُسن کا اندازِ حکومت
پھینک آئے ترے شہر میں سب کج کُلہی ہم

کم پاؤ گے ہم جیسے فقیرانِ محبت
پھیلا کے نہیں بیٹھتے دامانِ تہی ہم

یہ بُعد ہے برسوں کے نہ ملنے کا نتیجہ
مل جاؤ کسی دن تو وہی تم ہو وہی ہم

❖

○

تری گلی میں تماشا کیے زمانہ ہوا
پھر اس کے بعد نہ آنا ہوا نہ جانا ہوا

کچھ اتنا ٹوٹ کے چاہا تھا میرے دل نے اسے
وہ شخص میری مروّت میں بے وفا نہ ہوا

ہوا خفا تھی مگر اتنی سنگ دل بھی نہ تھی
ہمیں کو شمع جلانے کا حوصلہ نہ ہوا

مرے خلوص کی شیشہ گری بھی ہار گئی
وہ جانے کون سا پتھر تھا، آئینہ نہ ہوا

میں زہر پیتا رہا زندگی کے ہاتھوں سے
یہ اور بات ہے، میرا بدن ہرا نہ ہوا

شعور چاہئے ترتیب خار و خس کے لئے
قفس کو توڑ کے رکھا تو آشیانہ ہوا

ہمارے گاؤں کی مٹی ہی ریت جیسی تھی
یہ ایک رات کا سیلاب تو بہانہ ہوا

کسی کے ساتھ گئیں دل کی دھڑکنیں قیصرؔ
پھر اس کے بعد محبت کا حادثہ نہ ہوا

❖❖❖

○

پلکوں کا بوجھ پھینک کے کچھ دیر سو لئے
کتنا سکوں ملا جو سرِ شام رو لئے

پت جھڑ کی سائیں سائیں میں ہم کچھ نہ سن سکے
کہتی رہی بہار کہ دروازہ کھولئے

ناراض ہیں تو جایئے! لیکن یہ شرط ہے
ہم سے نہ بولئے تو کسی سے نہ بولئے

کس نے کہا تھا راہ سے ہٹ کر سفر کرو
ہم نے خود اپنے پاؤں میں کانٹے چبھو لئے

خوابوں کے ہار گوندھنے بیٹھی تھی زندگی
کم پڑ گئے جو پھول تو کانٹے پرو لئے

قیصرؔ ابھی غزل کے مسائل بہت سے ہیں
رونا تھا جتنی دیر محبت میں رو لئے

❖

○

پہلے سے ملو ہو نہ مدارات کرو ہو
اب دیکھ بھی لو ہو تو بڑی بات کرو ہو

یہ کوئی ستم تھا جو مکافات کرو ہو
دل توڑ کے روؤ ہو، بُری بات کرو ہو

آنا ہے نہ جانا ہے، نہ ملنا نہ ملانا
بس منھ سے ملاقات، ملاقات کرو ہو

تم شام گزارو ہو میاں! کون گلی میں
گھر لوٹ کے آنے میں بڑی رات کرو ہو

ہر سانس میں لہرائے ہے خوشبوئے محبت
کس پھول سے چھپ چھپ کے ملاقات کرو ہو

منزل سے بھی دشوار ہو اے ہم سفرو! تم
ہر گام پہ دوچار سوالات کرو ہو

شہزادے بنے پھرتے تھے تم گاؤں میں قیصرؔ
اب شہر میں کیسے گزراوقات کرو ہو

○

کسی نے میرا دُکھ جانا نہیں ہے
اُسے روؤں جسے پانا نہیں ہے

میں اک لمحے سے کیا امید رکھوں
مجھے صدیوں نے پہچانا نہیں ہے

بڑی مشکل سے دیوانہ ہوا ہوں
مجھے اب ہوش میں آنا نہیں ہے

نکل چلئے یہاں سے مُنہ چھُپا کر
ابھی لوگوں نے پہچانا نہیں ہے

دیے ہیں غم تو یارو! بھول جاؤ
مجھے یہ قرض لوٹانا نہیں ہے

یہ اُس کے نام کے آنسو ہیں قیصرؔ
اب ان پھولوں کو مرجھانا نہیں ہے

❖

○

غمِ جاں ہے غمِ جانانہ جیسا
پھرائے شہر میں دیوانہ جیسا

تعلق زندگی سے رات دن کا
مگر برتاؤ ہے بیگانہ جیسا

نیا دن بھی پرانا سا لگے ہے
تماشہ ہے وہی روزانہ جیسا

سِئے جائیں گے کتنوں کے گریباں
جسے دیکھو وہی دیوانہ جیسا

بدن اندر سے مٹی ہو رہا ہے
مگر چہرا نہیں ویرانہ جیسا

بنا ہوں آج میں بارِ سماعت
سنا جاؤں گا کل افسانہ جیسا

اسی کو آپ گھر کہتے ہیں قیصرؔ
بسا رکھا ہے جو ویرانہ جیسا

❖

○

چہرے پہ انتظار کی پرچھائیاں ملیں
ہم چُپ تھے، اس کے بعد بھی رسوائیاں ملیں

آیا نہ راس ہم کو سمندر سے بھاگنا
ساحل کے آس پاس بھی گہرائیاں ملیں

برسوں کے بعد لوٹ کے آئے جو گاؤں ہم
وہ چاندنی ملی نہ وہ انگنائیاں ملیں

پانی پہ تیرتی تھی ہماری غزل کبھی
ڈوبے جو آنسوؤں میں تو گہرائیاں ملیں

قیصرؔ مرے نصیب کے دن بہہ گئے کہاں
پانی پہ صرف شام کی پرچھائیاں ملیں

❖

○

مسافروں کا کبھی اعتبار مت کرنا
جہاں کہا تھا وہاں انتظار مت کرنا

میں نیند ہوں مری حد ہے تمہاری پلکوں تک
بدن جلا کے مرا انتظار مت کرنا

میں بچ گیا ہوں مگر سارے خواب ڈوب گئے
مری طرح بھی سمندر کو پار مت کرنا

بہالو اپنے شہیدوں کی قبر پر آنسو
مگر یہ حکم ہے کتبے شمار مت کرنا

ہوا عزیز ہے لیکن یہ اس کی ضد کیا ہے
تم اپنے گھر کے چراغوں کو پیار مت کرنا

یہ وقت بند دریچوں پہ لکھ گیا قیصرؔ
میں جا رہا ہوں مرا انتظار مت کرنا

❖

○

گزر گیا وہ مرے دل پہ حادثے کی طرح
چھنک کے ہاتھ سے ٹوٹا ہے آئینے کی طرح

بچھڑ کے تم سے یہ محسوس ہو رہا ہے مجھے
ہمارے بیچ کوئی شئے تھی فاصلے کی طرح

میں زندگی کو زمیں پر بچھائے بیٹھا ہوں
گزر رہے ہیں مسافر بھی راستے کی طرح

کہا تو تھا کہ چبھوں گا تمھاری آنکھوں میں
مجھے سنبھال کے رکھنا تھا آئنے کی طرح

ہمارے سینے میں دل ہے کہ جانئے کیا ہے
تپک رہی ہے کوئی چیز آبلے کی طرح

اگر ملا بھی تو سب حرف اڑ چکے ہونگے
مجھے تلاش نہ کر گمشدہ پتے کی طرح

کہیں نہیں ہوں تو قیصرؔ کہاں نہیں ہوں میں
تمام شہر میں بکھرا ہوں تبصرے کی طرح

❖❖❖

○

یوں بڑی دیر سے پیمانہ لئے بیٹھا ہوں
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ پئے بیٹھا ہوں

آخری ناؤ نہ آئی تو کہاں جاؤں گا
شام سے پار اُترنے کے لئے بیٹھا ہوں

مجھ کو معلوم ہے سچ زہر لگے ہے سب کو
بول سکتا ہوں مگر ہونٹ سئے بیٹھا ہوں

لوگ بھی اب مرے دروازے پہ کم آتے ہیں
میں بھی کچھ سوچ کے زنجیر دیئے بیٹھا ہوں

زندگی بھر کے لئے روٹھ کے جانے والے!
میں ابھی تک تری تصویر لئے بیٹھا ہوں

کم سے کم ریت سے آنکھیں تو بچیں گی قیصرؔ
میں ہواؤں کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا ہوں

❖

○

پل بھر میں ساری رات کا افسانہ ختم تھا
محفل میں خاک رہ گئی پروانہ ختم تھا

پرکھا نہ زندگی نے مرے دل کا حوصلہ
میں زہر پی رہا تھا کہ پیمانہ ختم تھا

ہم آخری جنوں کا تماشا دکھا گئے
پھر کاروبارِ کوچۂ جانانہ ختم تھا

دیکھا تو کائنات کی راہیں طویل تھیں
بھٹکے تو ایک جست میں ویرانہ ختم تھا

موسم کے ساتھ ساتھ بدلتی ہیں چاہتیں
سایہ گیا تو پیڑ سے یارانہ ختم تھا

قیصرؔ نے ساری عمر حکومت دلوں پہ کی
اس شخص پر مزاجِ فقیرانہ ختم تھا

○

اتنا سناٹا ہے بستی میں کہ ڈر جائے گا
چاند نکلا بھی تو چُپ چاپ گزر جائے گا

کیا خبر تھی کہ ہوا تیز چلے گی اتنی
سارا صحرا، مرے چہرے پہ بکھر جائے گا

ہم کسی موڑ پہ رُک جائیں گے چلتے چلتے
راستہ ٹوٹے ہوئے پُل پہ ٹھہر جائے گا

بادبانوں نے جو احسان جتایا اُس پر
بیچ دریا میں وہ کشتی سے اُتر جائے گا

چلتے رہئے کہ صفِ ہم سفراں لمبی ہے
جس کو رستے میں ٹھہرنا ہے ٹھہر جائے گا

در و دیوار پہ صدیوں کی کُہر چھائی ہے
گھر میں سورج بھی جو آیا تو ٹھٹھر جائے گا

فن وہ جگنو ہے جو اُڑتا ہے ہوا میں قیصرؔ
بند کر لو گے جو مٹھی میں تو مر جائے گا

○

ٹوٹنا، تیز ہواؤں کی نظر میں رہنا
خشک پتّہ ہوں، مرا دُکھ ہے سفر میں رہنا

آسمانوں کے سوا کچھ نہ ملے گا آگے
سیکھ لو بے در و دیوار کے گھر میں رہنا

شام سے چاروں طرف گھوم رہے ہیں قاتل
اپنے بچّوں سے محبت ہے تو گھر میں رہنا

سر جھکائے ہوئے ہم کوچۂ فن سے گزرے
ہم کو آیا نہیں پندارِ ہنر میں رہنا

میرے خوابوں کی امانت ہے تمہارا چہرا
میری اُجڑی ہوئی آنکھوں کے کھنڈر میں رہنا

سب ہواؤں کی خوشامد میں لگے ہیں قیصرؔ
کون چاہے گا مرے ساتھ بھنور میں رہنا

○

ناؤ بچاتا کتنا میں
لاکھ بھنور تھے، تنہا میں

دریا نے احسان کیا
سب سے پہلے ڈوبا میں

منزل جب نزدیک لگی
کاٹ گیا خود رستہ میں

بات نہ ہوگی چٹکی بھر
سوچ رہا ہوں کتنا میں

باہر باہر بادل ہوں
اندر اندر صحرا میں

چیخ رہی ہے خونی رات
کھولوں کیا دروازہ میں

قیصؔر یونہی عمر گئی
لمحہ لمحہ ٹوٹا میں

❖

○

منتشر ذہن کی سوچوں کو اکٹھا کر دو
تم جو آجاؤ تو شاید مجھے تنہا کر دو

در و دیوار پہ پڑھتا رہوں نوحہ کل کا
اس اُجالے سے تو بہتر ہے اندھیرا کر دو

اے مرے غم کی چٹانو! کبھی مل کر ٹوٹو
اس قدر زور سے چیخو مجھے بہرا کر دو

جا رہے ہو تو مرے خواب بھی لیتے جاؤ
دل اُجاڑا ہے تو آنکھوں کو بھی صحرا کر دو

کچھ نہیں ہے تو یہ پندارِ جنوں ہے قیصرؔ
تم کو مل جائے گریباں تو تماشا کر دو

○

مرے پیچھے پڑا ہے میرا سایا
میں کیوں اس دھوپ کے صحرا میں آیا

مری بستی پہ سورج گر پڑا ہے
کہیں دیوار باقی ہے نہ سایا

تو پھر کیا ہے بسیرا رات بھر کا
پرندے اجنبی جنگل پرایا

تماشہ میرے جنوں کا اور دنیا!
بہت سوچا تو اک پتھر اٹھایا

مری آنکھوں کا حاصل تھے وہ سپنے
میں جتنی دیر تم کو دیکھ پایا

ازل سے آج تک کا فاصلہ ناپ
میں کتنا چل کے اتنی دور آیا

کوئی تعبیر ملتی ہی نہیں ہے
میں کس کا خواب ہوں میرے خدایا

میں دنیا کی طرف لپکا تھا قیصرؔ
مگر دامن کا ٹکڑا ہاتھ آیا

❖

○

دوسروں کے لئے چھوڑ دینا پڑا
لکھتے لکھتے قلم توڑ دینا پڑا

زندگی ہے تمہاری گلی تو نہیں
چھوڑ دیں گے اگر چھوڑ دینا پڑا

زندگی کی کہانی ادھوری رہی
پڑھتے پڑھتے ورق موڑ دینا پڑا

میرے پیچھے بڑے تیز رو لوگ تھے
ہر جگہ راستہ چھوڑ دینا پڑا

زندگی کا بھنور اتنا آساں نہ تھا
سوہنی کو گھڑا چھوڑ دینا پڑا

اک حسیں مہرباں، سیکڑوں بدگماں
کاروبارِ غزل چھوڑ دینا پڑا

❖

○

پتوں کے ٹوٹنے کی صدا دیر تک چلی
کل دشتِ جسم و جاں میں ہوا دیر تک چلی

روشن رہیں نگارِ ہنر کی ہتھیلیاں
اپنی دکانِ رنگِ حنا دیر تک چلی

جب نیند اُڑ گئی تو ستارے بہت کھلے
جب رات گھٹ گئی تو ہوا دیر تک چلی

ہم بند کر کے سو گئے خوشبو کی کھڑکیاں
سنتے ہیں رات، بادِ صبا دیر تک چلی

محفل میں چل پڑی تھی ہمارے جنوں کی بات
پھر داستانِ چاکِ قبا دیر تک چلی

ساحل پہ آکے ڈوب گئیں سب عقیدتیں
گہرے سمندروں میں دعا دیر تک چلی

○

انتظارِ صبا رہا برسوں
اک دریچہ کھلا رہا برسوں

ایک لمحے کو پیار برسا تھا
اور میں بھیگتا رہا برسوں

بھولنا تھا اُسے سو بھول گئے
پھر بھی کچھ یاد سا رہا برسوں

تب کہیں جا کے اک غزل لکھی
میں اسے سوچتا رہا برسوں

جلتی آنکھوں میں کوئی آس نہ تھی
بس یونہی رتجگا رہا برسوں

بجھ گئی شمع ایک جھونکے میں
اور دُھواں گونجتا رہا برسوں

فاصلہ کم نہ ہو سکا قیصرؔ
آمنا سامنا رہا برسوں

○

بُھلا دیا تھا مگر یاد آ گیا تو پھر
بکھر گئے مری تنہائیوں کے گیسو پھر

تمہارے بعد کسی کے لئے نہ تڑپے ہم
چلا نہ دل پہ کسی کی نظر کا جادو پھر

ہم انتظار میں بیٹھے رہے سویرے تک
تمام رات دکھائی دیئے نہ جگنو پھر

اگر دریا ملا ہوتا

ذرا سی بات کا اتنا ملال کیا رکھنا
گزر گیا مرے کوچے سے بے ملے تو پھر

بہت دنوں سے بچھڑنے کا غم نہیں دیکھا
نکال روٹھ کے جانے کا کوئی پہلو پھر

نئی فرات پہ پہرے بٹھا دیے جائیں
کٹانے آئیں گے ہم اپنے دست و بازو پھر

ہمارے بعد کمانیں اُتر گئیں سب کی
شکارگاہ میں آیا نہ کوئی آہو پھر

گلی کے سارے دریچے تو بند تھے قیصر
کدھر سے آ گئی پچھلی رتوں کی خوشبو پھر

○

کیا کیا چہرے چیخ رہے ہیں یادوں کے انبار تلے
دل پر ایسا بوجھ دھرا ہے جو ہٹنے کا نام نہ لے

اپنی ٹوٹی چھت پر شاید اک دن سورج چمکا تھا
مٹھی میں کچھ دھوپ چرائے بیٹھا ہوں دیوار تلے

پت جھڑ کے آوارہ جھونکے ان پر ڈیرا ڈالے ہیں
جن شاخوں پر بچھڑے پنچھی آ ملتے تھے شام ڈھلے

قسمت ہم کو پھینک گئی ہے تیز ہوا کی راہوں میں
دل بھی کیا ہے ایک دیا ہے دیکھیں کتنی دیر جلے

منھ دیکھی باتوں میں یارو کیا رکھا ہے رہنے دو
حال ہمارا تم مت پوچھو' جاؤ ہم بیمار بھلے

دنیا کا دستور یہی ہے ناقدری کی بات نہیں
جو بھی لمحوں کو ٹھکرائے صدیوں اپنے ہاتھ ملے

اپنی اپنی سب کی راہیں اپنا اپنا سب کا سفر
تم بھی کس کے ساتھ چلے ہو ہم بھی کس کے ساتھ چلے

جانے رستہ بند ہے قیصرؔ یا کوئی پچھتاوا ہے
اس نگری سے جو بھی جائے پھر آنے کا نام نہ لے

❖❖

○

سارے جگنو کھو جائیں گے پل دو پل میں یار
رین بسیرا ڈھونڈ رہے ہو کس جنگل میں یار

کالی راتیں یاد کریں گی یہ چٹکی بھر آگ
ہم نے اپنا خون جلایا ہر مشعل میں یار

سوکھے دریا پھانک رہے ہیں پیلی پیلی ریت
سارا پانی بیٹھ گیا ہے کس دلدل میں یار

تلِ دو تلِ تو بڑھتے رہئے اپنے دل کی اُور
ورنہ کوئی فرق نہیں ہے کل اور کل میں یار

سولی پر لٹکائی گئی ہے سچائی کی لاش
تم بھی اپنا خون لٹا دو اس مقتل میں یار

چلّو بھر پانی کو قیصرؔ ترسائیں گے لوگ
تم بھی خیمہ ڈال کے بیٹھے کس کربل میں یار

○

مرے ساتھ چلتے چلتے یہ کہاں ٹھہر گئے تم
شبِ غم کٹے گی کیسے، جو ابھی سے ڈر گئے تم

وہاں شمع کیا جلے گی، جہاں بجھ گئے مراسم
وہاں چاند کیا کرے گا، جہاں شام کر گئے تم

مرے سامنے پڑا ہے ابھی آنسوؤں کا دریا
مرے ساتھ پانیوں میں یہ کہاں اُتر گئے تم

جہاں دفن ہے محبت، بڑی بے وفا جگہ تھی
نہ کبھی اُدھر گئے ہم، نہ کبھی اُدھر گئے تم

کبھی آ کے دیکھ جاؤ مری محویّت کا عالم
وہی درد چُن رہا ہوں جو بکھیر کر گئے تم

❖

○

سارے بندھن توڑ کے مت جا، کوئی تو پہلو باقی رکھ
چُپ ہونے میں دیر لگے گی، تھوڑے آنسو باقی رکھ

اتنی جلدی پھینک نہ باہر، سوکھے پھولوں کو
دن دو دن تو کمرہ مہکے، اتنی خوشبو باقی رکھ

غم کی رُت ہے کتنی لمبی، بھیگی آنکھیں کیا جانیں
بارش دو بارش تو چمکیں، اتنے جگنو باقی رکھ

تو نے اپنا ظرف دکھایا، میں نے دل پر جبر کیا
میں نے آنگن بانٹ دیا ہے، دیواریں تُو باقی رکھ

آنے والے لوگ بھی جانیں، پانی کیسا ہوتا ہے
سارا دریا جا تو پی جا، اک دو چلّو باقی رکھ

میرؔ کا فن ہو یا غالبؔ کا یا قیصرؔ کی غزلیں ہوں
سارا ماضی لَوٹ آئے گا، گھر میں اُردو باقی رکھ

○

راہ سورج نے بدل دی اپنی
آنکھ کھُلتی نہ تھی جلدی اپنی

بوند دو بوند نہ خوشبو ٹپکی
روح تک ہم نے مَسل دی اپنی

میرا چہرا نہیں میرا چہرا
راکھ حالات نے مَل دی اپنی

رات مُنھ دیکھ کے روتی شاید
لاش سورج نے کچل دی اپنی

مرتے رہتے تھے زمانے کے لئے
اب روِش ہم نے بدل دی اپنی

شمع نے توڑ کے باندھا رشتہ
روشنی چھوڑ کے چل دی اپنی

مُنھ سے اک لفظ نہ پھُوٹا قیصرؔ
کیسے گونگوں کو غزل دی اپنی

❖

○

جسم و جاں پر گزر گیا سب کچھ
کیا ہوا تھی بکھر گیا سب کچھ

تم ملو بھی تو اب، نہ پہچانوں
ذہن و دل سے اتر گیا سب کچھ

وقت برباد کر کے دیکھ لیا
وقت برباد کر گیا سب کچھ

اب تڑپنا ہے اور نہ تڑپانا
دل جو ٹھہرا ٹھہر گیا سب کچھ

اپنی زلفیں سنوار کر گویا
وہ یہ سمجھا سنور گیا سب کچھ

بہہ گئی میرے ساتھ بستی بھی
کون جانے کدھر گیا سب کچھ

دل دھڑکتا ہے آج بھی قیصرؔ
میں تو سمجھا تھا مر گیا سب کچھ

❖

○

ترے ہاتھوں کا پتھر کہہ رہا ہے
کہ دل ٹوٹا نہیں، توڑا گیا ہے

خفا مت ہو، ارے او بے مروّت!
مذاقاً بے مروّت کہہ دیا ہے

ابھی سے کیا ترے بارے میں سوچوں
کہ اس کے بعد برسوں سوچنا ہے

عجب رشتہ ہے دل سے آنسوؤں کا
کہ بن روئے بھی دامن بھیگتا ہے

اٹھا دینا نہ پھر دیوار کوئی
بڑی مشکل سے دروازہ کھُلا ہے

اسے کیسے کوئی بیگانہ کہہ دے
تعلّق ہے، بھلے ٹوٹا ہوا ہے

ذرا سا واقعہ تھا دل کا بُجھنا
ہواؤں نے دھواں پھیلا دیا ہے

نہ جانے دل پہ کیا بیتی ہے قیصرؔ
یوں ہی روتے رہیں جی چاہتا ہے

❖❖❖

○

میں پچھلی رات کیا جانے کہاں تھا
دعاؤں کا بھی لہجہ بے زباں تھا

ہوا گُم سُم تھی، سونا آشیاں تھا
پرندہ رات بھر جانے کہاں تھا

ہواؤں میں اُڑا کرتے تھے ہم بھی
ہمارے سامنے بھی آسماں تھا

اگر دریا ملا ہوتا

مری تقدیر تھی آوارہ گردی
مرا سارا قبیلہ بے مکاں تھا

مزے سے سو رہی تھی ساری بستی
جہاں میں تھا وہیں شاید دھواں تھا

میں اپنی لاش پر آنسو بہاتا
مجھے دُکھ تھا مگر اتنا کہاں تھا

سفر کاٹا ہے کتنی مشکلوں سے
وہاں سایہ نہ تھا، پانی جہاں تھا

کہاں سے آ گئی یہ خودنُمائی
وہیں پھینک آؤ، آئینہ جہاں تھا

میں قتلِ عام کا شاہد ہوں قیصرؔ
کہ بستی میں مرا اونچا مکاں تھا

○

رات کا پربت کاٹ رہے تھے نیند نے ہم کو آ لیا
بستی والو! راہ نہ دیکھو ہم نے دشت بسا لیا

خود ہی سب کا دامن بھر دیں، پیڑوں کا دستور نہیں
اس کی جھولی میں پھل آئے جس نے سنگ اٹھا لیا

دنیا کو سب آنسو دے دیں اتنے پاگل ہم نہ تھے
دل کے لئے بھی دو دن رولیں اتنا درد بچا لیا

موسم موسم پھیل گئی ہیں رسوائی کی سرحدیں
پہلے دامن چاک کیا تھا اب کے داغ لگا لیا

اندر اندر سُلگ رہی ہیں یادوں کی چنگاریاں
جس نے بھی یہ راکھ کُریدی اپنا ہاتھ جلا لیا

پت جھڑ کا موسم ہو قیصؔر یا پھولوں کا قافلہ
دروازے پر جو بھی آیا ہم نے گلے لگا لیا

○

مٹی پر اک پھول گرا، برباد ہوا
دنیا کو احساس بہت دن بعد ہوا

عشق کا مطلب کیا سمجھو گے لوگو! تم
ہم نے برسوں یاد کیا تب یاد ہوا

دل کا ٹوٹے تاروں سے کیا رشتہ ہے!
جو بھی نغمہ چھیڑ دیا، فریاد ہوا

تم کیا اپنے دل کا رونا روتے ہو
اس سے پہلے کس کا گھر آباد ہوا

صدیوں پر کیا بیتی ہوگی سوچو تو!
لمحہ تو برباد ہوا، برباد ہوا

ہم نے پتھر کاٹے اور سَر پھوڑ لیا
اس نے کاغذ پھاڑے اور فرہاد ہوا

شاید روتے روتے غزلیں لکھتے ہیں
قیصر جی کے شعر سنے، جی شاد ہوا

○

قطرہ قطرہ دریا پی گئے
آنکھیں مُوند کے دنیا پی گئے

پاؤں تلے کی ریت ہٹا کر
چھالے سارا صحرا پی گئے

میں دریا پر دیر سے پہونچا
پنچھی میرا حصّہ پی گئے

دھرتی کا دُکھ کون بُجھائے
بادل پیڑ کا سایہ پی گئے

غزلیں کہنا سہل نہیں، تھا
ہم پُرکھوں کا جوٹھا پی گئے

کن راہوں میں بھٹکے قیصرؔ
دھوپ کے جھونکے چہرا پی گئے

○

دل کی آگ کہاں لے جاتے جلتی بجھتی چھوڑ چلے
بنجاروں سے ڈرنے والو! لو ہم بستی چھوڑ چلے

آگے آگے چیخ رہا ہے صحرا کا اک زرد سفر
دریا جانے، ساحل جانے، ہم تو کشتی چھوڑ چلے

مٹی کے انبار کے نیچے ڈوب گیا مستقبل بھی
دیواروں نے دیکھا ہوگا، بچے تختی چھوڑ چلے

دنیا رکھے چاہے پھینکے، یہ ہے پڑی زنبیلِ سخن
ہم نے جتنی پونجی جوڑی، رتی رتی چھوڑ چلے

ساری عمر گنوا دی قیصرؔ، دو گز مٹی ہاتھ لگی
کتنی مہنگی چیز تھی دنیا، کتنی سستی چھوڑ چلے

❖

مَنُظومَاتُ

والعصر

زندگی سفر میں ہے
پرانے راستوں کی گرد پیچھے رہ گئی
آنے والے کل کی روشنی نظر میں ہے

ہزار قافلے اٹھے، کوئی دھواں بکھیرتا، کوئی لہو اچھالتا
ہزار قافلے اٹھے، کوئی چراغ بانٹتا، فضائے شب اجالتا
دھوپ چھاؤں کا سماں دشت و در میں ہے

اگر دیا ملا ہوتا

نئی صدی قریب ہے
ہمیں وہ سب نصیب ہے، وطن کو جس پہ ناز ہو
مرے وطن میں اے خدا نہ کوئی شر پسند ہو، نہ کوئی جنگ باز ہو
ختم ہو وہ معرکہ چھڑا جو خیر و شر میں ہے

مرے وطن کا آدمی قتل ہو کے رہ گیا، سپردِ خاک ہو گیا
جنوں نے وہ ستم کیا' دامنِ بہارِ جاں، چاک چاک ہو گیا
لہو کی قدر کیجئے، کہ چشم تر میں ہے

لہو کی قدر کیجئے، کچھ احترام کیجئے، اسے سلام کیجئے
یہی لہو عزیز ہے، سنبھالنے کی چیز ہے، صلائے عام کیجئے
یہی لہو شفق مثال کائنات بھر میں ہے

پس غبار روز و شب، سن رہا ہوں آہٹیں، شعور نو کے پاؤں کی
کھلیں گے پھول تازہ تر، مہک اٹھیں ادھر ادھر' بشارتیں ہواؤں کی
بہار تھوڑے دن ابھی، پردۂ سحر میں ہے

وہ ایک نورِ ابتدا، وہ ایک نورِ انتہا، وہ ایک نورِ جاوداں
محیطِ غرب و شرق ہے' زمیں اسی میں غرق ہے' ازل سے ہے رواں دواں
زمانہ جس کی باگ تھام کر سفر میں ہے

❖❖❖

مرے شہر کی رات

لہو کے علاوہ، دھوئیں کے سوا
مسافر زمیں کو کھنگالا کئے
کہیں کچھ نہ پایا کنوئیں کے سوا

در و بام پر غیریّت کی تہیں
جراحت سے ہے چوُر ہم سائیگی
کوئی مسکرائے تو آنسو بہیں

شرافت کا تابوت ہے آدمی
نکل آیا صدیوں کے اہرام سے
فراعین کا بھوت ہے آدمی

مسافر کہیں ہیں تو خیمہ کہیں
سفر رائیگاں، مستقر بے اماں
چلے تھے جہاں سے کھڑے ہیں وہیں

سروں پر اٹھائے ہوئے گھر چلے
پس پشت' دیوارِ بے چارگی
جو دروازہ کھولا تو پتھر چلے

یہ پتھر ترش کر نہ ہیرا ہوا
تعلق سکڑتا رہا روز و شب
سمندر سمٹ کر جزیرہ ہوا

اچانک یہ حالات کو کیا ہوا
نہ وہ چاندنی ہے نہ وہ آسماں
مرے شہر کی رات کو کیا ہوا

پرندوں کی شہہ رگ میں خوں کم نہیں
یہیں کھینچ لائیں نیا آسماں
کہ اب شامِ ہجرت کا موسم نہیں

❖❖

آخری صدی کے موڑ پر

نہ جانے زندگی کہاں ٹھہر گئی
یہ فصلِ انتظار بھی گزر گئی

کھُلا تھا اک دریچۂ فلک نما
مگر ہوا کا راستہ بدل گیا
تمام آسماں ہوا دُھواں دُھواں
زمیں کا ایک ایک خواب جل گیا
کھلی ہوئی فضا میں راکھ بھر گئی

رفاقتوں کا ترجماں تھا جو لہو
وہ اس تماشہ گر صدی میں بہہ گیا
وہ دردِ مشترک جو روشنی بنے
پگھل کے وقت کی ندی میں بہہ گیا
ندی بدن کی تہہ تلک اتر گئی

اگر دیا ملا ہوتا

درخت اپنے پھل کو خود ہی کھا گئے
زمیں کی گود میں گرا نہ کوئی بھی
سحر کے دستِ ناز بے حنا رہے
دعا کی آنکھ ساری رات روئی بھی
نہ جانے وہ ہوائے شب کدھر گئی

ہوائے سرد کہہ رہی ہے دیر سے
چراغِ جاں بجھا کے سو بھی جایئے
سفر میں کون پُوچھتا ہے حالِ دل
اُداسیوں کے بیچ کھو بھی جایئے
نگاہ میں جو صبح تھی وہ مر گئی

منزلوں کے خواب کا قصور کیا
پُشت کی طرف جو قافلہ چلے
جو رہروانِ تیز پا بھٹک گئے
تو ہم بھی نامُرادیاں اٹھا چلے
زمین اپنے زلزلوں سے ڈر گئی

حریفِ جاں سے کہو

جو ایک بار اُڑی تھی تمہارے چہرے پر
تمہارا عہد اسی خاکِ پا کی زد پر ہے

زمین بوجھ اٹھائے گی اور کتنے دن
تمام شہرِ ستمگر فنا کی زد پر ہے

ہزار بار جلاؤ ہزار بار بجھے
تمہاری شمع، ازل سے ہوا کی زد پر ہے

لہولہان شجر چیختے ہیں صدیوں سے
تمہاری تیشہ زنی بددعا کی زد پر ہے

ستارے ٹوٹنے والے ہیں پتھروں کی طرح
تمہاری شام ہماری نوا کی زد پر ہے

لرز رہے ہیں در و بام، کوچہ و بازار
کہاں چھپو گے کہ ہر چھت بلا کی زد پر ہے

یہ دور پھر کسی فرعون کو ڈبوئے گا
کہ سارا نیل کا پانی عصا کی زد پر ہے

سمٹنے والا ہے یہ کاروبار تیرہ شبی
تمہاری رات چراغِ حرا کی زد پر ہے

نکال پھینکیں گے تم کو تمہارے دروازے
تمہاری ساری خدائی، خدا کی زَد پر ہے

زمین چیخ رہی ہے

وہی ہُوا جو کہا تھا، مگر تمہیں لوگو!
مرے قلم کی بشارت پہ اعتبار نہ تھا
تم آسمان کے خوابوں میں کھوئے پھرتے تھے
تمہیں زمیں کی قیامت پہ اعتبار نہ تھا

کہا تو تھا کہ خدا کی زمین مت بانٹو
لہو کا ابر اٹھے گا انھیں لکیروں سے
یہ شرق و غرب کے ساحل نظر نہ آئیں گے
ابل پڑے گا سمندر انھیں جزیروں سے

کہا تو تھا کہ مشیّت خفا بھی ہوتی ہے
مگر تمہیں نے ان آیات پر نگاہ نہ کی
تم اک، چراغ جلا کر گھروں میں بیٹھ رہے
تنی ہوئی شبِ ظلمات پر نگاہ نہ کی

کہا تو تھا کہ ستم کی طناب مت تانو
کہ بادِ تند یہ خیمہ اُڑانے والی ہے
جہاں سمیٹ کے بیٹھو گے دھوپ مٹھی میں
وہیں اُمنڈ کے برسات آنے والی ہے

اگر دریا ملا ہوتا

کہا تو تھا کہ خرد پر غرور ٹھیک نہیں
یہ آسماں بھی کسی بد دعا سے ٹوٹے گا
سمندروں پہ بھروسہ درست ہے پھر بھی
یہ بلبلہ ہے، ذرا سی ہوا سے ٹوٹے گا

کہا تو تھا کہ دلوں پر عذاب مت توڑو
کہ زخم، شعلۂ جاں بن گئے تو کیا ہوگا
سمجھ رہے ہو جنھیں روشنی کے سیّارے
اگر یہ جل کے دھواں بن گئے تو کیا ہوگا

کہا تو تھا کہ زمانہ ہے انقلاب پسند
یہ ایک موڑ پہ صدیوں ٹھہر نہیں سکتا
ہزار مرگِ مفاجات کا تماشہ ہو
یہ زندگی کو فراموش کر نہیں سکتا

کہا تو تھا کہ یہ تلوار ہاتھ سے رکھ دو
کہا تو تھا کہ یہ جنگ و جدال ختم کرو
کہیں جواب چٹانوں سے لوٹ آئے نا!
زمین چیخ رہی ہے، سوال ختم کرو

جو سُن سکو تو ....

شعورِ راہ نمائی کا سر بسر فقدان
زوالِ ملّت و اُمّت کا مرحلہ ہے یہی

غرور جبّہ و دستار، زعم خود بینی
دلوں کو بانٹ رہا ہے وہ فاصلہ ہے یہی

تمام لوگ ہیں ظلمت پسند و نابینا
کہاں چراغ رکھا جائے مسئلہ ہے یہی

زمانہ روند کے رکھ دے گا ایک دن سب کو
اگر زمانہ پرستی کا سلسلہ ہے یہی

اگر دیا ملا ہوتا

سمندروں کو اٹھا کر زمیں پہ پھیلا دیں
جو بن سکو تو فرشتوں کا فیصلہ ہے یہی

ہوائیں چیختی رہتی ہیں اور ہم چُپ ہیں
لگے گا کون کنارے، جو حوصلہ ہے یہی

اسی طرح سے گزرتے ہیں کربلا والے؟
فُرات پوچھ رہی ہے، وہ قافلہ ہے یہی

فساد اور خدا کی زمیں کے سینے پر
انھیں کہو کہ بزرگوں سے کیا ملا ہے یہی!

نہ اتحاد، نہ حسنِ عمل، نہ دیدہ وری
ہماری پستیِ کردار کا صِلہ ہے یہی

کہاں ملے گا مسیحا، کہاں تلاش کروں
ٹپک رہا ہے بدن میں وہ آبلہ ہے یہی

ہزار عیب مری ذات میں سہی، قیصؔر
کوئی خلوص سے کہتا نہیں، گِلہ ہے یہی

کھول دیں بند دریچے .....

(پاکستانی دوستوں کے نام)

آؤ خوشبو کے لئے راہ نکالیں کوئی
کھول دیں بند دریچے کہ ہوا تو آئے

پھول مرجھائے ہیں شاخیں تو ابھی تازہ ہیں
یہ زمیں آج بھی زندہ ہے گھٹا تو آئے

مسجدوں میں بھی سنی جائے گجر کی آواز
مندروں میں بھی اذانوں کی صدا تو آئے

رنجشیں بھول بھی سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے
یاد تم کو کوئی پیمانِ وفا تو آئے

تم بھی فانوس بنو اور سنبھالو اس کو
ہم ہواؤں میں نئی شمع جلا تو آئے

ہم کو وہ پاسِ محبت تھا کہ دو اینٹ سہی
کچھ نہ کچھ بیچ کی دیوار گرا تو آئے

ساری دنیا کی بہاروں سے محبت ہے ہمیں
اتنی پت جھڑ میں بھی دو پھول کھلا تو آئے

روشنی سب کی ہے ٹکڑوں میں نہ تقسیم کرو
ہم نئی صبح کا پیغام سنا تو آئے

جب تلک حبس کا عالم ہے تو اک کام کریں!
کھول دیں بند دریچے کہ ہوا تو آئے

❖

یہ وہ بستی ہی نہیں.......

زندگی تو مجھے کس موڑ پہ لے آئی ہے
خواب کھلتے تھے جہاں برف وہاں چھائی ہے

سو دریچے ہیں مگر شمع کسی پر بھی نہیں
چاند نکلے، مری راتوں کا مقدر بھی نہیں
کیا کروں کیا نہ کروں، ہاتھ میں پتھر بھی نہیں
شیش محلوں کو کوئی غم بھی نہیں ڈر بھی نہیں

لوگ گونگے ہیں، بیاباں میں اذاں کیسے ہو
لوگ قاتل ہیں، علاجِ غمِ جاں کیسے ہو
لوگ پتھر ہیں تو احساسِ زیاں کیسے ہو
کس کو فرصت ہے جو پوچھے کہ میاں کیسے ہو

رات جب ختم ہوئی تھی تو سحر لگتی تھی
روشنی راہ گزر راہ گزر لگتی تھی
زندگی کوچۂ جاناں کا سفر لگتی تھی
اپنی منزل کہیں جنت کے اُدھر لگتی تھی

کچھ بھی آنکھوں میں نہیں اشکِ ندامت کے سوا
کچھ بھی دامن میں نہیں داغِ ملامت کے سوا
کچھ بھی چہرے پہ نہیں گردِ مسافت کے سوا
اپنی دوکان میں سب کچھ ہے محبت کے سوا

دانہ پانی

جھوٹی بات نہیں ہے یارو! سچّی رام کہانی ہے
آدھی ہم نے خود لکھّی ہے، باقی کی لکھوانی ہے

اتنی عمر کہاں گزری ہے، کچھ سپنا سا یاد پڑے
پھول ملے تھے یا انگارے، اس رُت میں کیا یاد پڑے
دل کی ٹوٹی پھوٹی دھڑکن پچپن سال پرانی ہے

اگر دریا ملا ہوتا

بچّے کی مٹھی سے اک دن ماں کی انگلی چھوٹ گئی
جس جھولے پر جھول رہا تھا اس کی رسّی ٹوٹ گئی
کس رشتے کا سایہ ڈھونڈے جب ممتا بھی فانی ہے

اپنے آنسو، اپنا دامن، کچھ دن ایسا حال رہا
دروازوں کی چول ہلا دی، برسوں وہ بھونچال رہا
کیسے ٹوٹا دل کا شیشہ آج حقیقت جانی ہے

جی بہلاوا، اِک پچھتاوا، گیت غزل افسانہ سب
کس نے کیا کیا عہد کئے تھے، بھول گیا دیوانہ سب
اب جنگل میں دیپ جلائے ساری رات بتانی ہے

کیوں پُرکھوں نے دھرتی بانٹی، کیوں دروازہ بند کیا
کیوں صدیوں کے دیش کو چھوڑا، کیوں پردیس پسند کیا
کیوں سونے کو مٹّی سمجھا آج تلک حیرانی ہے

راتیں بھی تھیں پاگل جیسی، ہوش اڑے تھے دن کے بھی
میں آندھی کے پیچھے بھاگا، ہاتھ نہ آئے تنکے بھی
ساحل پر بھی ڈوبا جاؤں، موسم وہ طوفانی ہے

سانسوں کا خیمہ اُڑ جائے اتنا تیز بگولا ہے
بے رسّی کے جھول رہا ہے، جیون ایسا جھولا ہے
اوپر پھانسی کا تختہ ہے، نیچے گہرا پانی ہے

خوابوں کی زنبیل بھری تھی، بے مصرف دن راتوں سے
آئینے کو لاکھ سنبھالا، گر کر ٹوٹا ہاتھوں سے
اب اس کی کرچوں پر رونا پچھتانا نادانی ہے

سر پر برسیں سوکھے پتے، یا چہرے پر دھول گرے
پت جھڑ کی تلوار سے کٹ کر ڈالی کا ہر پھول گرے
اس جنگل میں رہنا ہوگا، جب تک دانہ پانی ہے

کھویا ہوا گاؤں

آئیں گے اک دن پردیس والے
اے گاؤں! تھوڑے آنسو بچالے

یاد آرہے ہیں کھیتوں کے پھیرے
گیلی منڈیریں، بھیگے سویرے
بادل کے پیچھے، سونے کی تھالی
تھوڑا سا کاجل، تھوڑی سی لالی
پیڑوں کے نیچے دُھندلے اُجالے

اگر دریا ملا ہوتا

مسجد کے اوپر اُڑتے کبوتر
پیپل کا سایا مندر کی چھت پر
پنگھٹ سے لے کر گھر کی گلی تک
بھولے نہیں ہیں دل کو ابھی تک
وہ پھول، نیلے تالاب والے

پیپل پہ گونجے کوئل کی کوکو
بھیگی ہوا میں مٹّی کی خوشبو
امرائیوں میں چرواہے جھومیں
ریوڑ چرائیں، کھیتوں میں گھومیں
لاٹھی اُٹھائے، چادر سنبھالے

گھر کے سویرے، باغوں کی شامیں
دل اُڑ رہا ہے ٹھنڈی ہَوا میں
پنگھٹ کا پتّھر، چھیّا رے چھیّا
بے تال پانی، گہری تلیّا
بیٹھی ہے گوری، پَیر اپنے ڈالے

وہ بوڑھے بابا ستّر برس کے
سَر سے انگوچھا باندھے ہیں کَس کے
روئی کی گٹھری، وہ بوڑھی نانی
چھیڑیں ہمیشہ باتیں پرانی
آگا نہ پیچھا، بچّے نہ بالے

چکّی پہ آٹا پیسے سہاگن
ماتھے پہ بندیا، ہاتھوں میں کنگن
تھالی کٹورا، چوکا رسوئی
رہتی ہو جیسے کچھ کھوئی کھوئی
جلتے توے پر انگلی جلالے

لگتا ہے سب کچھ گُم ہو گیا ہے
سپنے بچے ہیں، مَن کھو گیا ہے
کس گوں میں ہوگا اب گاؤں اپنا
جانے نہ کوئی جی کا تڑپنا
دُکھ سُکھ کریں ہم کس کے حوالے

نیلی جلد کی کتاب

میرے گھر میں جھونج بنائے گوریا کا جوڑا
چونچ میں لے کر آئے جائے بھُوسہ تھوڑا تھوڑا
بھُوسے میں کچھ تنکے بھی ہیں کچھ ٹیا لے پَر
نیلے پیلے اجلے میلے بھورے کالے پر
باغوں باغوں ہو کر آئے اپنا گھر نہ بھولے
پہلے وہ رسّی پر بیٹھے پل بھر جھولا جھولے
پھر الماری میں اُڑ کر جائے سیدھے اپنے کونے
غالب کا دیوان چنا ہے رہنے کو ان دونے
نیلی نیلی جلد پہ جیسے پھول رکھا ہو کوئی
یا کاغذ کو رات سمجھ کر چاند اُگا ہو کوئی
قسمت والے ٹھہرے ان کے لال گلابی پنجے
اُردو کا اک شاعر آیا ان کے پاؤں کے نیچے
چاندی جیسے تخت پہ سو کر گزریں راتیں ان کی
غالب صاحب سنتے ہونگے شاید باتیں ان کی
ماضی کی بنیاد پہ رکھا ہے مستقبل سب کا
آنے والے دَور میں لوگو! اٹکا ہے دل سب کا
گوریا کے ان خوابوں کو کیسے توڑا جائے
کوئی نُسخہ اور منگا لیں، اس کو چھوڑا جائے

❖

ایک لمحہ

میں اپنی زندگی سے ایک لمحے کا سوالی ہوں
وہ لمحہ جو مرے نغموں کو چھو کر جاوداں کر دے
مرے دل کو جگا دے، روح کے شعلے جواں کر دے

نہ آنکھوں میں کوئی صورت، نہ کوئی نام ہونٹوں پر
نہ جانے کون ہے جو روح کو بیتاب رکھتا ہے
ستاروں کی طرح آ کر بکھر جاتا ہے پلکوں پر
نہ جانے کون ہے جو رات بھر بے خواب رکھتا ہے

تمہیں دیکھا تو کِھل اٹھا مرے خوابوں کا آئینہ
وہی نازک، وہی معصوم سا چہرا نظر آیا
تمہارے ہونٹ پر بکھری نظر آئی بہار اپنی
تمہارا حُسن اپنی روح کا حصّہ نظر آیا

محبت جب سمندر بن چکی تو سوچنا کیسا
بہت ممکن ہے ان لہروں میں آ جائے کنارا بھی
ڈبو دے دو دلوں کو، اتنا ظالم ہو نہیں سکتا
یہ طوفاں جو مقدّر ہے تمہارا بھی، ہمارا بھی

اگر دیا ملا ہوتا

تمہاری آنکھ سے ٹپکا نہیں اب تک کوئی آنسو
مرے چاروں طرف طوفان برپا ہے قیامت کا
مری بیتاب امیدوں کو ٹھکرا دو کہ اپنا لو
تمہارے فیصلے پر فیصلہ ہے میری قسمت کا

پرانی ہو چکی ہیں پیار کے قدموں کی زنجیریں
نئے رستے پہ اپنے آپ ہی سب ٹوٹ جائیں گی
ہمارے سامنے ہوگی محبت کی نئی منزل
ملیں گے ہم تو یہ دنیا کی رسمیں چھوٹ جائیں گی

یہ کالا آسماں کچھ بھی نہیں دھوکا ہے پل بھر کا
چراغاں ہی چراغاں ایک دن محفل میں ہوتا ہے
تڑپ کر روح پہ گرتی ہے یوں بجلی محبت کی
دھواں آنکھوں سے اٹھتا ہے، اجالا دل میں ہوتا ہے

مچلتا ہے جو دل میں اور ہونٹوں تک نہیں آتا
محبت کی طرح وہ گیت بھی معصوم ہوتا ہے
سناتی ہے تمہاری آنکھ جب کوئی حسیں نغمہ
تو مجھ کو وقت بھی ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے

یہ پیاسے خواب، یہ ویران شامیں اور یہ تنہائی
تمہاری روح سے بچھڑا ہوا آوارہ سایا ہوں
ابھی تک میرے دل کا درد پہچانا نہیں تم نے
جو پلکوں پر نہیں آتے وہ آنسو ساتھ لایا ہوں

محبت جب کسی سنگم پہ ملتی ہے محبت سے
تو ایسی لہر آتی ہے کہ دنیا بھیگ جاتی ہے
سلگتی دھڑکنیں پلکوں سے چھن چھن کر برستی ہیں
زباں خاموش رہتی ہے، نظر وعدہ نبھاتی ہے

تم آنا چاہتی ہو، دل کی دھڑکن روک دیتی ہے
یہ کیسی کشمکش ہے، پاؤں رُکتے ہیں نہ چلتے ہیں
نہ اقرارِ تمنا ہے، نہ انکارِ محبت ہے
یہ کیسے دیپ ہیں ظالم کہ بجھتے ہیں نہ جلتے ہیں

میں اپنی زندگی سے ایک لمحہ چھین لایا ہوں
چُرا کر زندگی سے کوئی لمحہ تم بھی لے آؤ
مرے ہاتھوں میں اک سازِ محبت ہے. بہت دن سے
بہاروں کا کوئی معصوم نغمہ تم بھی لے آؤ

ہم ان نغموں سے اک بہتا ہوا دریا بنا ڈالیں
بھلا کر ساری دنیا، اک نئی دنیا بنا ڈالیں
پرایا سا ہے جو لمحہ اسے اپنا بنا ڈالیں

کیوں شمع جلائی آخرِ شب

خوش آمدید کہوں کیا یہ شب عذاب کی ہے
یہاں ملی ہو جو منزل شکستِ خواب کی ہے

یہ میں ہوں یا کوئی آنسو تمہاری پلکوں کا
یہ تم ہو یا کوئی الجھن مرے شباب کی ہے

مرے وجود کو دیکھو نہ اس توجہ سے
یہ آفتاب نہیں، لاش آفتاب کی ہے

تم آنسوؤں کو مری جان! پڑھ نہ پاؤ گی
یہ داستاں کسی بھیگی ہوئی کتاب کی ہے

نہ پونچھو اپنے دوپٹے سے میری پیشانی
یہ خاکِ راہ تو سوغات انقلاب کی ہے

شباب چھوڑ گیا دے کے ایک دردِ سفر
یہ یادگار، اسی کوچۂ خراب کی ہے

عجیب سوچ میں ہے زندگی کا دوراہا
نہ اب سکون کی صورت نہ اضطراب کی ہے

یہ لب ہیں یا کسی گزری ہوئی بہار کے پھول
بدن ہے یا کوئی خالی دکاں شراب کی ہے

میں سن رہا ہوں تمہارے لبوں کی خاموشی
غزل غزل مرے ماضی کے انتخاب کی ہے

بھٹک رہا ہوں میں اس بے دلی کے صحرا میں
جہاں گناہ کا ڈر ہے نہ دھن ثواب کی ہے

اگر دریا ملا ہوتا

تمہارے رُخ پہ ہے آئینہ ٹوٹنے کا نشاں
مہک مشام میں سوکھے ہوئے گلاب کی ہے

یہ تیس سال کی دوری، یہ ایک روز کا قرب
سکوں کا موڑ بھی تصویر اضطراب کی ہے

ندی کے سامنے کھلتا ہے گھر کا دروازہ
مرے مکان کے پیچھے گلی سراب کی ہے

تیرا درد مری شاعری کے کام آیا
یہ روشنی اسی گم گشتہ ماہتاب کی ہے

کہاں سے لاؤں ستارے جو تم کو نذر کروں
یہ شب تو روح کے داغوں کے احتساب کی ہے

میں انتظار میں تھا جب تو ہاتھ چھوڑ دیا
یہاں ملی ہو جو منزل شکستِ خواب کی ہے

میں آنسوؤں کو کہوں کیا کہ چھلکے پڑتے ہیں
خوش آمدید کہوں کیا کہ شب عذاب کی ہے

پچھتاوا

در و دیوار پہ ہجرت کے نشاں دیکھ آئیں
آؤ! ہم اپنے بزرگوں کے مکاں دیکھ آئیں

اپنی قسمت میں لکھے ہیں جو وراثت کی طرح
آؤ! اک بار وہ زخمِ دل و جاں دیکھ آئیں

آؤ! بھیگی ہوئی آنکھوں سے پڑھیں نوحۂ دل
آؤ! بکھرے ہوئے رشتوں کا زیاں دیکھ آئیں

اگر دریا ملا ہوتا

جس سے ٹکرا کے گرے تھے کبھی اربابِ خرد
آؤ! نزدیک سے وہ سنگِ گراں دیکھ آئیں

وقت جاتے ہوئے کیا لکھ گیا پیشانی پر
آؤ! آشفتگیٔ عہدِ رواں دیکھ آئیں

ٹوٹا ٹوٹا ہوا دل لے کے پھریں گلیوں میں
کچی مٹی کے کھلونوں کی دُکاں دیکھ آئیں

روشنی کے کہیں آثار تو باقی ہوں گے
آؤ! پگھلی ہوئی شمعوں کا دھواں دیکھ آئیں

جن درختوں کے تلے رقصِ صبا ہوتا تھا
سوکھے پتوں کا برسنا بھی وہاں دیکھ آئیں

اُڑ رہے ہوں گے کہیں، جھنڈ ابابیلوں کے
آؤ! سنسان دریچوں کا سماں دیکھ آئیں

اب فرشتوں کے سِوا کوئی نہ آتا ہوگا
کون دیتا ہے خرابے میں اذاں، دیکھ آئیں

مدتوں بعد مہاجر کی طرح آئے ہیں
روٹھ جائے نہ کھنڈر، آؤ میاں! دیکھ آئیں

حرفِ اظہار

.... قیصرؔ الجعفری اس عہد کے وہ مقبول شاعر ہیں جنہیں پڑھا بھی جاتا ہے اور دنیا کے گوشے گوشے میں سنا بھی جاتا ہے۔ وہ اردو غزل کا ایک معتبر نام ہیں اور ہمہ موضوع شاعر بھی۔ ۱۹۶۴ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ رنگِ حِنا شائع ہوا تھا، چالیس سال سے ان کا قلم رواں دواں ہے اور اب تک ان کی گیارہ سے زائد شعری تخلیقات منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور اردو، ہندی دونوں حلقوں میں اپنی نمایاں شناخت بنا چکے ہیں۔ قیصر صاحب کی منظوم سیرت النبیؐ ''چراغِ حرا'' اس عہد کی اسلامی ادب میں ایک اضافہ تصور کی جا رہی ہے۔ یہ کتاب شعریّت اور شریعت کا نادر نمونہ بھی ہے اور قیصر صاحب کے لئے سرمایۂ آخرت بھی۔ اس شاہکار تصنیف کو ہم دوبارہ شائع کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ دشتِ بے تمنّا کے بعد قیصر صاحب کا تازہ مجموعہ ''اگر دریا ملا ہوتا'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

قیصر صاحب کی شاعری کے تعلق سے مجھ سا ناچیز کیا رائے دے سکتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ غزل ان کا مزاج بن چکی ہے اور وہ غزل کا مزاج اور طبیعت ہو چکے ہیں۔

قیصرؔ الجعفری کی اور بھی کتابیں زیرِ ترتیب ہیں۔ فن و شخصیت پر ایک مبسوط شمارہ ترتیب کے مراحل میں ہے جس میں محترم ڈاکٹر آدم شیخ صاحب، ڈائریکٹر انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مصروف ہیں۔ قیصر صاحب کا ایک اور مجموعہ نعت و منقبت ''غیب سے ناد بھیج دو'' ہماری دوسری ترجیح ہے۔

اگر دریا ملا ہوتا

ہمارا ادارہ قیصر الجعفری فاؤنڈیشن بھی ادبی، ثقافتی اور سماجی میدان میں برسوں سے مصروفِ عمل ہے۔ یہ ادارہ تجارتی نہیں ہے۔ ہماری پوری کوشش ہے کہ ہمارا یہ ادارہ زندہ پرستی کی علامت بن کر ابھرے اور اردو ادب کے حلقے کو اور وسیع اور تازہ کار بنائے۔ ہم اپنی زبان سے مایوس نہیں ہیں اور نہ کسی احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو اردو سے رشتہ توڑ چکا ہے وہ پھر اس سے جڑے اور اپنا گراں مایہ سرمایہ نئی نسل تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرے۔

ہم سعودی عرب، پاکستان اور ہندوستان کے ان ادیبوں اور اردو دوستوں کے ممنون کرم ہیں جن کے تقاضوں نے ہمیں ''اگر دریا ملا ہوتا'' کی اشاعت کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ ہم ہندی زبان کے ان قیصر نواز شخصیتوں کے بھی احسان مند ہیں جو ان کی ہندی رسم الخط میں شعری کتابوں کی پذیرائی میں آگے آگے ہیں۔ جن میں اہلِ قلم بھی شامل ہیں اور عوامی حلقہ بھی۔ بقول ظ انصاری، قیصر صاحب کی کتابیں بوسیدہ نہیں ہوتیں، اہلِ ذوق انہیں اپنے ذہن میں بسا لیتے ہیں۔

اس دور میں ہر وہ شخص جو اردو سے محبت رکھتا ہے، اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے کہ اسے اپنی زبان کا حق ادا کرنا ہے، ہمیشہ اور ہر صورت میں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ قارئین اس کتاب کی بھرپور پذیرائی کریں گے۔

ڈاکٹر شیخ عبداللہ
(صدر، قیصر الجعفری فاؤنڈیشن)

(جعفری صاحب کے انتقال کے بعد زیرِ نظر مضمون میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ ماضی کا صیغہ استعمال کرتے وقت دل و دماغ اور قلم نے رلا دیا اس لئے مضمون من و عن ہے)

زیر اشاعت

میں نے ایک سمندر لکھا (کلیات)

قیصر الجعفری چراغ حرا کی روشنی میں۔ ڈاکٹر آدم شی

قیصر الجعفری، فن و شخصیت۔ مقبول واجد ایم۔ اے

اعزازات

سنگ آشنا — ۱۹۷۷ء مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا دوسرا ایوارڈ

دشتِ بے تمنا — ۱۹۸۷ء مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا پہلا ایوارڈ

چراغ حرا — ۱۹۹۷ء مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا پہلا ایوارڈ

مولسری کا پھول — ۲۰۰۲ء اتر پردیش اردو اکیڈمی

سراج اورنگ آبادی ریاستی ایوارڈ ۲۰۰۲ء حکومت مہاراشٹ

پرنس علی نقی ثاقب ایوارڈ ۱۹۹۰ء ۴۰۰ رسالہ جشن حیدر آباد کے موقع پر

ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ، دہلی ۲۰۰۵ء

ممبر۔ شعبہ اردو برائے درس و تدریس ممبئی یونیورسٹی

AGAR DARYA MILA HOTA

Poetic Collection By

QAISAR-UL-JAFRI

آنے والے لوگ قیصرؔ پڑھ کے روئیں گے ہمیں
نام دیواروں پہ صدیوں تک لکھا رہ جائے گا

Presented By

Qaisar-Ul-Jafri Foundation, Mumbai.

Printed by Adabi Printing Press, Tel.: 2302 1353